قاضی عبدالستار

پیتل کا گھنٹہ

ناولٹ اور افسانے

قاضی عبدالستار پیتل کا گھنٹہ ناولٹ اور افسانے

ناولٹ اور افسانے

قاضی عبدالستار

قاضی عبدالستار

اُپنیاس پرکاشن
۱- بائی کا باغ الہ آباد

بار اول جنوری سنہ ۱۹۷۷ء

تعداد اشاعت ۵۰۰

طابع اسرار کریمی پریس

ناشر دوارکاناتھ بھارگو

۶/- روپے

اپنے چچا

قاضی محمود علی صاحب

کے نام

فہرست

پیتل کا گھنٹہ

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے۔ لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اُتر پڑا۔ کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ ایک بار نگاہ اُٹھی تو سامنے دور درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔ میں ابھی سگریٹ سُلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کُھردُرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لی۔ میں اس کی بےتکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا۔

"یہ کون گاؤں ہے ــــ؟" میں نے میناروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ..... پوبھسول ہے ــ"

پیتل کا گھنٹہ

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آگئی۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور چوڑے پائنچے کا پاجامہ اور رفل کی ٹوپی دیے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگار کے ہاتھ سے پھولوں کی بدھیاں لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کرکے تلخی سے کہا۔ "کیا یہ کافی نہیں تھی۔؟" — وہ میری بات پی گئے۔ بدھیاں برابر کیں پھر میرے ننگے سر پہ ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا — "اب تشریف لے جائیے"۔ میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔" بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں۔

بھسول کے قاضی انعام حسین، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخ نگاہوں پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آکر کئی بار موقع ڈھونڈھ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد بھی ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا اگرٹی "لبس" کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا جُتے
ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی،
جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں
طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں
گے۔ ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اُونچے آم کے درخت ٹرافک کے سپاہی کی طرح
چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے، جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی
کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے وہاں
اس وقت نہ کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے
جُھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیص، میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر کے تلّوں کا پرانا پمپ
پہنے ہوئے، ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔
جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے یک دم کھل گئے میرے ہاتھ
سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح
جھکی ہوئی تھی دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی ہی سے چلّائے۔ "ارے سُنتی ہو ——— دیکھو تو کون آیا ہے
میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے۔" لیکن دادی تو
سامنے ہی کھڑی تھیں، ڈھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس داد ان کو دیکھ کر سپٹا

گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔ پھر اُنھوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین
کی دُھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اُوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر
دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھُپ جائے۔

اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ
اور دُکھ کی گنگا جمنی آوازمیں دُعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری بات سُن رہی تھیں۔
لیکن ہاتھوں سے جن کی جھُریاں بھری کھال جھُول گئی تھی۔ دالان کے اکلوتے ثابت
پلنگ کو صاف کر رہی تھیں جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلھیاں اور پان کی ڈلیاں
ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں، مجھے پلنگ پر بیٹھا کر دوسرے جھلنگا
پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اُٹھا لائیں، جس کے چاروں طرف کالے کپڑے کی گوٹ
لگی تھی اور کھڑی ہوئی میرے اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے چھین نہ لیا
پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا
چولہا بنا تھا۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں کچھ پیپے کچھ ڈبے کچھ شیشے بوتل اور دو چار اسی
قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے چولہے
کے سامنے بیٹھی تھیں۔ دادا نے کونے میں کھڑے ہوئے پرانے حقّہ سے بے رنگ چلم اتاری
اور باورچی خانہ میں گھُس گئے۔ میں ان دونوں کی گھن گھن کرتی سرگوشیاں سُنتا
رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے۔ میں نے اپنی شیروانی اتاری
اِدھر اُدھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی۔ نقشین کیواڑ کو

دیمک چاٹ گئی تھی - ایک جگہ لوہے کی پتی لگی تھی - لیکن بیچوں بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام، کتھے اور تیل کے دھبّوں میں جگمگا رہا تھا - بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں درڑوں دوڑوں دادا گھرونچی پر سے گھڑا اُٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے - جس میں ایک بھی کیواڑ نہ تھا - صرف گھیرے لگے کٹڑے تھے - جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجرم کی طرح بولے۔

"تم بیٹے اطمینان سے نہاؤ - اِدھر کوئی نہیں آئے گا - پردے تو میں ڈال دوں لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی، اور تم کو دِق کرے گی -

میں گھڑے کو ایک کونے میں اُٹھالے گیا وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا میں نے جھک کر دیکھا - گھنٹے میں موگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے - دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسّی بندھی تھی - اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا اس کے اوپر سات پہل کا ستارہ تھا - میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا - عربی رسم الخط میں "قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ" کھدا ہوا تھا یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آ رہا تھا - میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لئے اُٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اُٹھا سکا - دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر دیکھتا رہا - میں دیر تک نہاتا رہا جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے - قاضی انعام حسین جن

کی گدی نشین ہوئی تھی۔ جن کے لئے بندوقوں کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا جنہیں
ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں پر خدمتگاروں کی طرح طباق اُٹھائے
ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں "لب سوز" لب بند چائے سے
لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو اُبلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے
گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں ہم لوگ بیٹھے نمک پڑی ہوئی
چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بوڑھی آواز نے ہانک لگائی:۔

"مالک"

"کون"

"مہتر ہے آپ کا ــــ صاحب جی کا بلاوا آئے ہے"

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر
چلے گئے اپنے بھلے دنوں میں تو اس طرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے
ہوں گے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا تو ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی
تھی دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔ میں
ڈیوڑھی سے ڈبیا اُٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے
رہے۔ دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے ــــ اپنی جوانی کے

قصّے سُناتے رہے۔ کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دستر خوان لگایا۔ بہت سی ان میل بے جوڑ اصلی چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چُنا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا۔

صبح میں دیر سے اُٹھا ــــ یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چُنا ہوا تھا دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے ــــ جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا۔ دادی خاموش کھڑی رہیں، جیسے ہی [illegible] دروازے پر یکّہ آگیا، تب دادی نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا۔ اُن کے چہرے پر چونا پُتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، اُنھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا " یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرائے کے "

" ارے ..... ارے دادی..... آپ کیا کر رہی ہیں! " اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

چُپ رہو تم.... تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں۔ جو جس کا حق ہوتا ہے، وہ دے تو دیتے ہیں ــــ غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آئے اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چِٹ بھی نہ دے سکوں... میں ... بھیّا ..... تیری دادی تو فقیرن ہو گئی... بھکارن ہو گئی ــــ

معلوم نہیں کہاں کہاں کا زخم کھُل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں،

دادا میری طرف پشت کئے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقّہ پی رہے تھے۔ مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئیں لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک میرے یکّہ کے ساتھ چلتے رہے، لیکن نہ مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ ایک بار نگاہ اُٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی جہاں سے سیتاپور کے لئے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکّہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکّہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا.... میاں۔ اِلّی شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں ان کے یکّہ کا بم ٹوٹ گوا ہے، آپ بُرا نہ مانو تو اِلّی بیٹھ جائیں۔"

میری اجازت پا کر اُس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکّے والے نے میرے اور ان کے سامنے "پیتل کا گھنٹہ" دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔ دو اُنگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسّی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسن آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستارے کا مونو گرام بنا ہوا تھا۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور

یکے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکےّ والے سے رہا نہ گیا، اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو؟"

ہاں! کل شام کا معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دیہن بُلائے کے۔ ای ..."

"ہاں وقت وقت کی بات ہے ــــ شاہ جی ناہیں تو ای گھنٹہ ....

اے گھوڑے کی دُم راستا دیکھ کے چل ....." یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔

میں .... میاں کا بُرا وقت ..... چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔

••

مالکن

۱۹۵۰ء میں جو سیلاب آیا تھا، اس نے سیتاپور سے لیکر لکھیم پور کھیری
تک کے سارے "گانجر" کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن
گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل
چل کر آئی اور سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہاتوں کو زمین
کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہو گئی۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھالی
کی طرح ننگا پڑا تھا۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں
سے اکّا دکّا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آجاتے تھے۔ جیسے شہد کی مکھیوں
کے بڑے بڑے چھتّے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچّی تھی۔ لیکن کوئی سو برس سے گھنگھور
برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر
جہازی پلنگ بچھائے جا سکتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک نوسکھیا چور رونق پور کے

نجیب الطرفین کا مہمان ہوا۔ رال ٹپکاتی نظروں سے حویلی کو دیکھ کر ہتھیلیاں کھجلانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھلانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ میزبان کو دل لگی سوجھی۔ اس نے کچھ اتا پتا بتا کر آدھی رات کو رخصت کر دیا۔ مہمان ایک دیوار پر سابر لے کر جُٹ گیا۔ کھودتا رہا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ دیوار اسی طرح کھڑی تھی۔ اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بیچارہ نامراد واپس ہوا۔ لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی۔ " جل بھون "نہیں بنایا تھا۔ اوپر سے "ہتھیا نکمت" برستا تھا اور نیچے برجھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا، پھر دیوان خانہ۔ جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے تب چودھری گلاب کی نمک حلالی کو غیرت آئی —
علاقے بھر کے نامی نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اُتر گئے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

" حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے — حکم دیجیے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھا لاؤں اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا۔ گھاگرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی بھیانک آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب نے آہستہ سے پھر کہا — تو آواز آئی۔

تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب۔ خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے، یہیں جہاں اب حویلی کھڑی ہے۔ یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔ اسی گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں۔ ان سے آگ برسی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہو گیا تھا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے۔ سو ہم آج پھر مٹ جائیں گے۔"
چودھری گلاب کھڑے رہے۔ مالکن کے پچھوان کی کڑکڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی بیگ کی بیوہ پر رونق پور کی "مالکن" پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا؟ اور انھیں کچھ چھوڑنے کو پڑی ہی کیا تھی! نہ آل نہ اولاد ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائداد۔ مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ برسوں کی مسلسل اور نکھٹ لٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری گلاب الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا ہے کہ واقعی میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان ہی گئے ہیں۔ وہ رات عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جا نماز پر بیٹھی رہیں۔ ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں۔ عورتیں ساری رات حقّے کی چلمیں بھرتی رہیں اور چلمیں سلگ سلگ کر جلتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے

ٹٹس پج گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اور باغ درخت سب کھٹیا بتاشے کی طرح بٹ گئے جیسے بندوق کا فائر ہوتے ہی پرندوں کے غول اُڑ جائیں۔ مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری۔ چودھری گلاب کو ہدایتیں دے دے کر ان گنت مقدمے لڑاتی رہیں۔ جیسے حضرت محل نے غدر میں فوجیں لڑائی تھیں۔ شکست تو حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن کو بھی ہوئی۔ لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن نے شکست مانی نہیں۔ مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی بکھرنے لگے۔ عورتیں نکلنے لگیں۔ آخر آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم کر دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے نیئے میرے مقدمے لڑانے لگے۔ ہولی دیوالی پر آتے۔ پاؤ آدھ سیر مٹھائی کا دونا نذر میں بھیجتے اور س طرح وضعداری کو نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے اور مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اندر سے باہر تک سب اُجڑ گیا۔ گائے، بیل، شامیانے چھولداریاں، جاجمیں، قالین دریغ، پتیلے، کرسی، میزیں، پلنگ پیڑھی سب باورچی خانے کو زندہ رکھنے کے ا کرم گئے۔

پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھ کر اُٹھیں۔ مونج کی پٹاری کے پاندان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دو ڈلے اور پتی کی تمباکو کا پھنکا لگایا اور کھنڈر کے اس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے

کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹّی کی ہانڈیوں کے منھ دیکھے جو ان کے
پیٹ کی طرح خالی تھے۔ گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی وہیں
زمین پر بیٹھ گئیں، جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی لنگڑاتی ہوئی
نگاہیں اس سنسان ویران لق و دق کھنڈر میں رینگتی رہیں، جس کی چھتیں گر
چکی تھیں، دھنیّاں جل چکی تھیں دروازے بِک چکے تھے اور جس کے در و دیوار
خدمت گزار انسانوں کی مودب پرچھائیوں کے رنجگوں کو ترستے تھے۔ اور شاید ترستے
ترستے بھول چکے تھے۔ ان کی بھوکی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور
پیوند لگے ہوئے موٹی تنزیب کے کسیلے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر اُنھوں نے ایک
انجانی آہٹ محسوس کی اور کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کانپنے لگیں
لیکن کانوں سے ٹکراتی ہوئی اس مقدس آواز کو سنتی رہیں جس سے ماتا کا رس
ٹپک رہا تھا۔

زیب النسا بیگم ...... تم ان اشراف زادوں کی اولاد ہو جن کی تلوار
نے سلطنتوں کی تقدیریں لکھی ہیں اور تخت و تاج کے فیصلے کیے ہیں۔ تم
ان درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے قرآن شریف نقل کیے ہیں اور پیٹ
بھرا ہے۔ تم تلوار نہیں ہلا سکتیں ...... تم قلم نہیں اُٹھا سکتیں ..... لیکن تم
سوئی تو چلا سکتی ہو۔ تمہارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے "چھتر منزل کلب"
کی میموں کے ساتھ ڈنر اڑائے ہیں اور لنچ کھائے ہیں .... کیا کہا تم نے؟

اب انگرکھے کون پہنتا ہے؟..... اب اگر انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہوگا... تم کو یاد ہے؟ میں نے لکھنو سے کٹاؤ کے جو کرتے سلوائے تھے ان کی سلائی اس سستے زمانے میں کیا تھی؟... پانچ روپیہ فی کرتا... تم ویسا کرتا دو دن میں سل سکتی ہو۔"

جب وہ اُٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آچکا تھا۔ جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اُٹھیں ہوں ــ جیسے سارے دن کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اُٹھا رہی تھیں کہ اس طرف سے آواز آئی، جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ اُنھوں نے دوپٹے کو اس طرح بنا کر اوڑھا کہ تمام پیوند اِدھر اُدھر ہوگئے اور چٹیاں کچّے آنگن میں آہستہ آہستہ رکھتی ہوئی اس ویران کھمّبے کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں جو کبھی ڈیوڑھی کے گرانڈیل منقّش دروازے کا سہارا تھا۔

"میں ہوں مالکن...... گلاب لال۔"

"اچھے ہو.... چودھری گلاب؟"

"مالکن کی کرپا ہے......"

"کیسے آگئے۔"

"ایک سندیسہ آیا ہے۔"

"کیا"

"پاکستان سے خاں صاحب آئے ہیں ۔ وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔"

"ہاں ہاں منے خاں..... جن کا بھتیجہ ہمارے یہاں سپاہیوں میں تھا۔"

"جی ہاں ۔ جی ہاں وہی ۔ ان کے تو بڑے ٹھاٹ ہیں پاکستان میں ۔ سب لڑکے ان کے بڑی بڑی جگہوں پر ہو گئے ہیں۔"

"اچھا"

"جی ہاں.... موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے ۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضل مرزا صاحب جو آج کل کراچی میں بڑے کمشنر ہیں اُنھوں نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ چلی آویں۔"

"افضل مرزا میرا بھائی تھوڑی ہے موا.... میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔"

"تو اُنھوں نے آپ کو بلایا ہے... بلکہ خانصاحب تو کہتے تھے کہ ان کو پاسپورٹ بھی اُنھوں نے اس لئے بڑی دوڑ دھوپ کر کے دلایا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آویں۔"

"مجھ کم بختی کی ماری پر اب ایسے بھی برے وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایرے غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤں گی۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں

کو سیمنٹ لے جائیے اپنے ساتھ پاکستان کو.... مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے جب تک حکم نہیں آتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔"

"وہ کہہ رہے تھے"

"گولی مارو چودھری گلاب.... کہنا سننا کاہے کا...."

"جی.... بہتر ہے"

"ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی"

"حکم"

"یہاں رونق پور میں یا.... کسی اور گاؤں میں کوئی...."

"جی"

"میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں"

"کوئی کرتے پہنتا ہے"

مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی — چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سُن کر پھٹ پڑی ہو۔ بوڑھا چودھری گلاب اس عجیب و غریب سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

"کرتے"

"ہاں تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب.... تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو تم تو حویلی کے دائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چرانا۔ آدمی

حق سب چلے گئے — عورتیں اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوّے ہنکایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گزر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پہ سوار رہتے ہیں۔ ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی کرتا ارتا ہوتا تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔"

حویلی کے بوڑھے راز دار کے تخیّل کی آنکھیں بھو کی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

"تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب —"

"نہیں مالکن — میں شام تک آجاؤں گا۔"

"مگر دیکھو۔ کسی ایسے ویسے کا گرتا نہ لے آنا میرے پاس۔"

"نہیں مالکن۔"

"میرا نام نہ لینا کسی سے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مالکن؟ میں کوئی آج حویلی میں نوکر ہوا ہوں"

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا اور سوار ہو کر بغیر خاں صاحب سے ملے ہوئے نھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک بیٹھک کے تخت پر بیٹھے سلفہ گڑگڑاتے رہے۔ جب سورج سر پر آگیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر "چوکے" کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وہ

اونگھتے ہوئے اُٹھے ۔ آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے پکّے کنویں کی چبوترا پر کھڑے ہوکر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکائے چوکے پر بیٹھ گئے ۔ چودھرائن روٹی سینک سینک کر رکھتی جا رہی تھیں ۔ مگر وہاں پہلا نوالہ ہی ہاتھوں میں جھول رہا تھا ۔

" کا تمرا کچھ جی ماندہ ہے ؟ "

" ہاں ۔ "

" تو تھوڑا بہت تو کھائے لیو ۔ "

" تمرے پاس کتنے روپئے ہیں ؟ "

" روپے ؟ مورے پاس اپنی ایک چھدام نائیں ہے بڑے بھیّا کے کچھ دام دھرے ہیں ۔ "

" کتنے ہیں بھلا ؟ "

" ہیں کوئی دس گھاٹ پچاس ۔ "

" لے آؤ ۔ "

" ابھیں ؟ "

" ہاں ۔ "

" پہلے روٹی تو کھائے لیو ۔ "

" پہلے لے آؤ ۔ "

چودھری گلاب نے ہارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کے کاغذ نکال کر گنے

اور تھالی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے آنکھیں پھاڑے دیکھا کیں پھر بکنے جھکنے لگیں۔ لیکن چودھری گلاب نے ان کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار کر پہنا۔ دھوتی بنا کر باندھی ٹوپی سر پر اور انگوچھا کندھے پر رکھ کر چلے آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔ گھسیٹتے ہوئے تھان کے باہر لائے اور سوار ہو گئے بھو کا ٹٹو اپنی چال بھر چل رہا تھا لیکن چودھری گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے والے کئی انجن دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے۔ لیکن ان کے مرتے ہی جب حویلی اجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی تلاش میں حویلی سے اڑ گئے تب مالکن نے اپنے ایک ایک تنکے کی باقاعدہ دیکھ بھال چودھری گلاب کے سپرد کر دی تھی۔ چودھری ان لوگوں میں تھے جو حال کی جیب سے آنے والے برے دنوں کا منہ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پر لگا کر اڑ گیا ان کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور دوسرا نہر میں چپراسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے لیکن چودھری کی لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا اور نہ پٹرول مجبوراً انھوں نے چپراسیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ آئے دن منہ کھولے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ لیکن چودھری خود ہی کھکھ بیٹھے تھے ان کا بھرنا کہاں سے بھرتے اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ بڑکو اتنا گرہست اور سگھڑ کب سے ہو گیا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا

وہ یہی سب کچھ الابلا سوچتے ہوئے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دوکان پر اُنھوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تنزیب کے تھان پر کھنے لگے دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہونچے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چھمن لال کی پڑھائی ہوئی ساری فارسی کا آموختہ پڑھ کر مالکن سے مخاطب ہوئے اور ان کو یقین دلایا کہ پوری راز داری کے ساتھ وہ چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا حلق سوکھ گیا۔ کانٹے سے پڑنے لگے۔ ساری جان پسینے میں نہا گئی۔ ان کی مٹھی میں دبے ہوئے پچیس روپوں کی پڑیا بھیگ گئی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس ۲۵ روپے مالکن کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے وجود کا منوں بار گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنیے کی دوکان پر آ گئے۔ رام پرشاد گدی پر بیٹھا گاہک کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دُعا کے بعد اُنھوں نے مالکن کا حساب مانگا تو پتہ چلا کہ وہ سو سے اوپر ہے۔ اسی لئے تو رام پرشاد نے ان کا سودا بند کر دیا تھا۔ اسی لئے تو مالکن کا باورچی خانہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ رام پرشاد کی دوکان کے تختے پر بیٹھے ہوئے اپنے پچیس روپیوں کی پڑیا کو نہارتے رہے۔ بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہو گئے جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لئے جھنگا کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انھیں پہلی بار عرفان ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لئے صرف ہاتھ کے فن اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں سوئی

اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جتنے میں سوئی تاگا آتا ہے اتنے میں ایک وقت کے آلو اور دو وقت کے چنے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی اور ان کی ناؤن ناخن کاٹنے آگئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے خیالوں کی کچّی نیند سے چونک پڑیں اور ناؤن سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں جیسے لہجے میں اگر وہ اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوتیں تو وہ سارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈھورا پیٹ آتی۔

"ارے اے قادر کی دھی۔"

"جی، بی بی۔"

"میرا ایک کام کر دو گی اتنے وقت۔"

"بتائیے۔"

"ذرا لپکی ہوئی رام پرشاد کی دوکان چلی جاؤ اور ایک مہین سوئی اور چھوٹی پھک لے آؤ۔ لیکن اس حرام زادے سے میرا نام نہ لینا۔ نہیں تو ٹکا سا جواب دے دے گا۔ کل میں نے دو پیسے کا نمک، خیر چھوڑ..... تم ذرا چلی جاؤ۔"

وہ اپنی داہنی کنپٹی پر لیکھ ٹٹولتی ہوئی آنگن پار کرنے لگی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں معلوم نہیں کیا سوچتی رہیں۔ جب ناؤن سوئی تاگا لے آئی۔ تو اسی سے اس کی قینچی منگوائی اور کرتے بیونتنے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے انھیں خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کی ناپ تو لائے ہی نہیں کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر

رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصہ تین چار میل دور تھا۔ اب ایسا آدمی اس وقت کہاں جُڑتا جو اسی وقت چودھری کو بُلا کر کہتا۔ پھر اُنھوں نے دیوار پر چڑھتی ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور منگل کو رونق پور کی بازار ہوتی ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر آجائیں بازار کرنے۔ اپنے اس وہم پر ایمان لاکر وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اُٹھیں وضو کے بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا۔ وضو کیا اور نماز کے لئے وہ چٹائی بچھائی جس پر کپڑے کے پیوند لگے تھے جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ چھوٹا سا وظیفہ پڑھ کر لمبی سی دُعا مانگی کہ اے پروردگار عالم اپنی رحمت کے صدقے میں چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں یہ نیکی ڈال دے کہ وہ آکر اپنے کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر کرتا سی سکوں۔ وہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے نڈھال ہوگئیں۔ اسی جانماز پر دوہری ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ مہترانی ہمیشہ کی طرح دو وقتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی امید سے تازہ دم ہو کر اُٹھ بیٹھیں۔

"بانکے کی بہو"

"بی بی"

"بانکے ہیں گھر پر؟"

"ہیں بی بی"

"ذرا جلدی سے جاکے بلا لا... کوئی کام نہیں ہے۔ بس ایک بات پوچھنا ہے۔"

وہ اُلٹے پیروں چلی گئی۔ پھر دروازے پر صدا بلند ہوئی۔

"سرکار کی بڑھتی ہو۔ راج پاٹ بنا رہے۔"

"بانکے۔"

"سرکار۔"

"چیت پور تمہاری جمانی میں ہے؟"

"ہاں جور۔"

"ٹھاکر گھنشیام کو پہچانتے ہو۔"

"ان کا سرکار کون نائیں پہچانت ہے... دور دور تک ان کا نام باجت ہے۔"

"بازار تو آتے ہوں گے۔"

"برابر مالک.... برابر۔"

"تو تم ذرا خیال کر کے ان کو میرے پاس بلا لانا۔ مجھے ایک کام ہے ان سے۔"

"بہت نیک مالک۔ ابہین لیو آپ.... کا کچھ دور تھوڑے ہے۔"

بانکے تو اپنا چہرہ دھاجوتا بجاتا اور رٹی ہوئی دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ لیکن اپنی زبان کی دڑاکی پر مالکن پچھتاتی رہیں۔ شرماتی رہیں اور بیٹھی دعا مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں۔ بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ اپنا کرتا بھجوا دیں۔ ورنہ میں اُن سے کس طرح بات کروں گی۔ میں کیا کہوں گی۔ وہ کیا کہیں گے۔ یا اللہ کچھ ایسا کیجو کہ مرنے

والے کے سامنے میری آنکھیں نہ نیچی ہوں۔

بانکے نے اپنی بکری کے سوپ پیٹھ پر باندھے اور بازار کے ایک نکّڑ پر بیٹھ رہا جہاں ادّھے کھولے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگھرو بجاتا اور دھول اُڑاتا ٹھاکر کا ادّھا آگیا۔ وہ اپنے سوپ سنبھال کر اُٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھاند پڑا۔ اس نے گاہک کو ٹالنے کے لئے بڑی ٹرّی زبان میں بات کی لیکن اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر پیسے گنتا ہوا وہ ٹھاکر کے پیچھے بھاگا۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دوکان پر پہنچے۔ رام پرشاد نے جلدی سے کھڑے ہوکر سلام کیا اور دو ایک گاہکوں کو ہٹا کر دوکان کے باہری پٹرے پر دری ڈال دی۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولئے سے اپنا مُنہ پوچھا، پھر اسی سے پیروں کی گرد جھاڑی، نگاہ اُٹھائی تو سامنے بانکے جُھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

"کاہے رے"

"ایک اُجُر (عذر) ہے"

"ہاں"

"مالکن آپ کا بُلائن ہیں۔"

"مالکن؟"

"ہاں..... یہاں کے سرکار کی مالکن۔"

"اچھا..... کاہے بلائن ہیں..... کچھ اتا پتا ہے بھلا۔"

"یو سرکار آپ جان سکت ہو..... ہم کا نائیں معلوم۔"

ٹھاکر جیت پور کے نمبری زمیندار تھے اور میر محمد علی بیگ مرحوم کے ہوا خواہوں میں تھے۔ مرحوم کے ایک ایک فاتحے میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ادھر بھول کر بھی نہ گزرے تھے۔ اب آج اس اچانک پیام سے گھرا گئے تھے۔ پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چودھری گلاب نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن ٹھاکر نے دبوچ لیا۔

"ارے چودھری۔ ای مالکن کاہے بُلائن ہیں ہم کا؟"

چودھری کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن ننگے بازوؤں پر انگوچھا پھیلا کر بولے۔

"وہ..... وہ..... دراصل ٹھاکر صاحب مالکن نے آپ کو اس لئے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں اُنھیں میری ضرورت تھی اور آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے نکلتی ہی ہے۔ اسی لئے آپ کو۔"

"اچھا..... میں کہوں کہ ایسی کیا بات آپڑی۔ پھر ٹھیک ہے..... تو مطلب یہ کہ اب وہاں جانے کی چنتا تو ہے نہیں۔"

"اب آپ کیوں تکلیف کریں گے..... میں تو آہی گیا۔"

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں۔ جو سنلائٹ صابن سے پھینچا گیا تھا اور سنلائٹ صابن کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں۔ پھر یہ سوچکر چپ ہو رہیں کہ جب رونق پور پر یہ بیتی ہے تو جیت پور پربھی کچھ نہ کچھ تو گزری ہی ہوگی۔ پھر وہ اسی وقت کرتا کاٹنے بیٹھ گئیں جب تک اندھیرا نہ ہوگیا اور ان کو سوئی نظر آتی رہی وہ اسی طرح پُرنم آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں اور روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد اُنھوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بھبک اُٹھتی تھی، جیسے مالکن کے دُکھ پر رُوتے رُوتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں ہوں۔ دُکھتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے رنجور آنکھوں سے کپڑا بھڑائے وہ سلتی رہیں۔ اپنے دسترخوان کے چاک کو بھرتی رہیں اپنی تار تار جیب کو رفو کرتی رہیں۔ جھاگ ایسی سفید تنزیب کے ویرانے میں لکڑیاں بنتی رہیں، ارہر کی دال چنتی رہیں، اور موتی! ایسے صاف صاف گیہوں کے اُجلے اُجلے آٹے کو گوندھنے کا سامان کرتی رہیں۔ پھر سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سُدھ ہو کر بانس کے کھٹولے پر دُہری ہوگئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں مسین سلائی کے پھول ایسے سک سجل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کے چہرے پر جھریوں کا جال اور گہرا ہوگیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں اُبال کر تھالی میں ڈال دیئے گئے ہوں گھر پر سوگ سا چھا گیا۔ گھر والی نے پہلے خود چودھری کو سمجھایا پھر لڑکوں کو ان کے حلقوں سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے ملکر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہابھارت چھیڑ دی۔ جیسے جیسے بات بڑھتی گئی۔ خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کی ایک ہی کجھی میں بولایا تھا کڑک کر کہا۔

"ارے اماں تم کا جانو.... یو بڈھا اس بڑھیا ملکن سے پھنسا ہے"
بوڑھے چودھری گلاب نرائن جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، اس الزام اس بھیانک الزام کو سُن کر دیوانے سے ہوگئے۔ وہ جہاں کھڑے ہوئے جو مکھی لڑ رہے تھے وہیں زمین پر دھب سے بیٹھ گئے، یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے۔ چھوٹا لڑکا ثبوت دے رہا تھا۔

"جب بہیا (سیلاب) آئی ہے اوئی سال تو ای جان پر کھیل کے او کا بدمعاس کا بچاوے گئے رہیں،... گئے رہیں کہ نائیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں۔"

چودھری گلاب نرائن کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی

پرچھائیں دیکھ لی۔ گویا شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فیر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنے وجود کی لاش اُٹھا کر اُٹھے اور کرڑھتے ہوئے دروازے سے نکلے۔ اپنی چوکھٹ.... اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں ڈالی ہوئی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے چوما اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے، بغیر آنکھوں سے ایک آنسو بہائے اس پختہ کنویں پر چڑھ گئے جس کی جگت آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آکر جہازی گھڑے کی رسی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ سارا اتھان گاؤں ہل گیا۔ گاؤں کا گاؤں الٹ پڑا۔ آدمی کنویں کے اندر اُتر گئے۔ چودھری گلاب نرائن نکال بھی لئے گئے۔ لیکن وہ تو اُسی وقت مر گئے تھے جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سُنی تھی۔

کہانیوں سے.... چٹ پٹی کہانیوں سے السانوں کو.... گاؤں کے ان انسانوں کو جن کے حواس ہر طرح کی بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں.... جو پیدائشی محبت ہوتی ہے.... جو قاتل محبت ہوتی ہے اس محبت نے چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر لیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن.... تو چودھری گلاب نرائن پر میر محمد علی بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد تو اور کھل کھیلیں۔ منّے خاں نے کتنا کتنا کہا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں۔ پاکستان جانے پر جہاں لوگ اپنی آل اولاد اپنے محل دو محلے اپنے

گاؤں گرام تک چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی راتیں عاشقوں کے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھیں۔ وہ مالکن کو گھورہی تھی۔ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی ایک سفید لٹ چاندی کے جھوم کی زنجیر کی طرح ان کی پیشانی پر جھولتی رہتی۔ نازک خدوخال کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے ڈال دیئے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی تاب ابھی مر نہیں پائی تھی۔ ان گنت جاگتی راتوں نے ان کی آنکھوں کا نشہ سکھا دیا تھا لیکن اب بھی جب وہ پلکیں اُٹھا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو مخاطب کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر تو ایسی جھوٹی کہانی بھی سچّی معلوم ہوتی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی بکھری ہوئی ٹوٹی ہوئی عمارت کی یادگاریں وہ محرم کی ایک "روشن چوکی" کی طرح جھلملایا کرتیں۔ دل ہلا دینے والی یادوں کے مؤدّب قافلے ان کی کم نور آنکھوں کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتے رہتے جیت، بیساکھ کے جلتے تپتے دن، ساون بھادوں کی روتی ہوئی کلموہی راتیں..... سب کھوٹے سکوں کی طرح ان کے وجود کی "گولک" میں کھنکھنایا کرتیں اور وہ ان کی بے فیض "جھناجھن" سے بے نیاز چھوٹی چھوٹی مادی کلفتوں کے ناقابل بیان بوجھ میں دبی کراہا کرتیں۔

ایک دن جب وہ چودھری گلاب زاہن کا انتظار کرتے کرتے سوکھ چکی تھی اور

مالکن

اُن دنوں کا اُن بھیانک دنوں کا انتظار کرنے لگی تھیں جو ان کے لئے فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی دیواروں کو پھلانگ کر ان کے کچّے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی۔ قہقہے لگانے لگی۔ ان کے مُنہ پر تھوکنے لگی۔ رونق پور کی مالکن کے اس مُنہ پر تھوکنے لگی۔ جس منہ کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ اُٹھ کر بغیر دروازوں کی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر دو زانو ہو کر اس خدائے قہار کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے بندوں پر اپنے پیارے بندوں پر اس لئے مصیبتیں نازل کرتا ہے تاکہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔ ان کے ایمان پر صیقل ہو سکے۔ پھر اسی دن رونق پور کی تینتیس سال کی زندگی میں پہلی بار اُنھوں نے چودھری گلاب نرائن کو مرد کے روپ میں دیکھا۔ اُنھوں نے دیکھا۔ حویلی کے اندرونی حصے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ ایک طرف چوکے کی مسند پر گاؤ سے لگے ہوئے میر محمد علی بیگ موم بیٹھے ہوئے ہیں دور کونے میں سلگتی ہوئی مہکتی ہوئی مُشک کی کامدار نَے ان کے زانو پر پڑی ہے جس کی گنگا جمنی منہال سے ان کی انگلیاں کھیل رہی ہیں نگاہیں دیوارگیری پر جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھی دانت کے نازک کام کی بھاری سی میز ناشتے کی پلیٹوں کا بوجھ اُٹھائے خوبصورت کنیز کی طرح دو زانو ہے۔ وہ اپنی مسہری سے اُٹھیں۔ ایک ہاتھ میں فرشی پائجامے کے بھاری پائینچے

لئے دوسرے ہاتھ سے استنبولی بیل سے جھولتے ہوئے دوپٹے کا پلّو سنبھالا۔ موٹے موٹے زیوروں سے ہلکی ہلکی زرّیں جھنکار پیدا کرتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی ملی دلی آستین پر انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے مرصع ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"تم اتنے اداس کیوں ہو...."

"اداس..... نہیں تو"

"نہ تو تم نے غسل کیا.... نہ ناشتہ کیا.... کتنی دیر سے اسی طرح بیٹھے ہو —"

"ہوں"

"ایک بات کہوں"

"ہوں"

"غصہ تو نہ کروگے"

"اُہ۔ہوں"

"حکیم ڈاکٹر دوائیں کرتے ہیں۔ نصیبے نہیں بناتے..... مجھ کوکھ جلی کے مقدر ہی میں اولاد نہیں ہے تو حکیم ڈاکٹر کیا کرلیں گے..... میری مانو تو..... دوسری شادی"

"چپ رہو —"

وہ اتنے زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی عورتوں کے ہاتھ

سو گھ گئے کہ کتنی ہی دیر تک ویسی ہی بھیانک خاموشی مسلّط رہی۔ پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی آ کر تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مالکن نے اشارے سے پوچھا "کیا ہے؟"

"تھان گاؤں والا گلاب زائن ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"

"بلاؤ۔"

دالان کے پردے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اوسط قد کا سوکھا ساکھا سا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کرتے کے ایک مونڈھے پر پیوند لگا تھا۔ نسبتاً اُجلی دھوتی پر گھٹنے کے پاس پھانک سلی ہوئی تھی دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں، پنجے جوتے میں بند ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ٹوپی میں میل کی گوٹ لگی تھی۔ وہ سہما ہوا کھڑا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔

"دوا لے آئے؟"

"ہاں سرکار"

اُس آدمی نے گڑگڑا کر کہا

"دیدو۔"

اس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہے اور اس میں لبالب عطر بھرا ہوا ہے .... پھر آواز آئی

" اس کو گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلوادو "

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ کو ملیں تو دھوپ آنگن میں اُترنے لگی تھی۔ اور ذہن میں آئے ہوئے جان دینے کے سارے منصوبے دیوالی کے چراغوں کی طرح بجھ چکے تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر ٹوکرا رکھے اور آدھے کا گھونگھٹ نکالے بانکے کی بہو کمانے آگئی۔

" ارے تم جیت پور جاؤگی "

" ہاں بی بی "

" تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ شام کو اگر بازار آئیں تو مجھ سے مل لیں "

" بہت اچھا "

مالکن اتنا کہہ کر باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھیں کہ وہ دروازے پر کچھ تند تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اچھلنے پھاندنے لگیں۔ مالکن کی نگاہوں کا اشارہ پاکر مہترانی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لانبی ڈیلی عورت کے ساتھ واپس آئی جو لال کنارے کی سفید دھوتی پہنے تھی۔ مہترانی نے اس عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

" ای تھان گاؤں والے چودھری گلاب کیری چھوٹی بہو ہیں...... لیلادھر کی دولہن "

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے اعصاب کو سنبھال کر یہ سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا مدارات کریں کہ اس نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے

اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر ہر جذبے سے خالی آواز میں منمنائی ۔

" ای کرتے آپے دھر لیو "

جملہ پورا کرتے ہوئے وہ تیر کی طرح آنگن ختم کر کے ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی دیواروں کے پیچ وخم میں غائب ہوگئی ۔ ذرا دیر تک مہترانی نے ان کا جائزہ لیا اور دوسرا گھر کمانے چلی گئی ۔ مالکن بھول سے کورے کرتے داہنے ہاتھ میں اُٹھائے آنگن میں کھڑی رہیں — جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور مصیبتوں کے فاتح لشکر کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو ۔

شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے جیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے مالکن کہہ رہی تھیں ۔

" اپنے کرتوں کی تہذیب تو آپ سیکھتے رہیئے گا لیکن پہلے میرے یہ چاروں کرتے بکوا دیجیئے "

••

مجّو بھیا

پنڈت آنند سہائے تعلقدار گگراواں کے مرتے ہی شیخ مسرور علی نے مختاری کے چونچلوں کو سلام کیا اور کمر کھول دی۔ رئیس پنڈت درگا سہائے نے جھوٹ موٹ کی للّو چپّو بھی کی لیکن شیخ جی (وہ گگراواں میں اسی نام سے پکارے جاتے تھے) اپنے ٹانگن پر سوار ہو کر مان پور آ ہی گئے۔ شروع شروع میں شیخ کو مان پور میں ایسا لگا جیسے صبح سورج کی مشعل لئے شام کو ڈھونڈھا کرتی ہے اور شام اپنی آرتی میں ستارے جلائے صبح کی راہ تکا کرتی ہے۔ مگر جیت کے آتے آتے اُنھوں نے کاشتکاروں سے اپنی "سیر" نکال لی اور چار جوڑ بیل خرید کر کھیتی شروع کر دی۔ پہلا پانی پڑتے ہی بستی سے ملے ہوئے پچاس بیگھے کے پلاٹ پر کنواں کھود کر قلمی باغ کی طرح بھی ڈال دی۔ لیکن وقت اب بھی کاٹے نہ کٹتا۔ آخر کار اُنھوں نے اپنی شیخی کو طاق پر رکھا اور بستی کے بڑے بوڑھوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ کسی کو تعویذ لکھ دیتے، کسی کو سرمے منجن کا نسخہ بتاتے، کسی کے پھوڑے

بھنسی میں اپنے ہاتھ سے پولٹس باندھتے، کسی کا خط لکھتے، کسی کا مقدمہ لڑتے۔ غرض پانچ چھ ہزار کی بستی وہ بھی مسلمان بستی ان کا وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ شبرات کا چاند دیکھ کر وہ اپنی بیٹھک میں تخت پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے کہ چھوٹے خاں اور گاؤں کے چودھری میر بخش دو چار بڑے بوڑھوں کے ساتھ آ گئے۔ شیخ نے ان کو پلنگوں پر بٹھایا۔ اور منظور کو آواز دی وہ سیاہ لنگوٹ باندھے موٹے موٹے ہاتھ پیروں پر تازی تازی مٹی ملے دندناتا ہوا آیا اور بھونچکوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ شیخ نے بیٹے کا جو یہ حلیہ دیکھا تو حقّہ کی چلم کی طرح جل گئے۔ کڑک کر پوچھا:

"یہ کیا ؟" منظور نے ممنا کر جواب دیا کہ مدّی چچا سے کشتی لڑ رہا تھا۔ مدّی جو بڑے بڑے پہلوانوں سے لنگوٹ چھین چکا ہے۔ شیخ معلوم نہیں کیا کیا سوچ ڈالتے کہ چھوٹے خاں نے چونکا دیا۔

"شیخ جی ——! بستی میں ساری برادریوں کے چودھریوں نے ایک بات طے کی ہے ——"

"میں بغیر سنے مانے لیتا ہوں ——"، شیخ بولے

"ماننے کی بات نہیں کرنے کی ہے ——"

"معلوم بھی تو ہو ——"

"بات یہ ہے کہ ہماری مسجد ہے بہت چھوٹی اور بستی کے نمازی تو آپ جانتے ہی ہیں پانچ چھ ہزار کی بستی کے نمازی ہیں —— سمائیں تو کہاں سمائیں۔ جہاں تک پیسے کا معاملہ ہے تو روپیہ گھر بھی لے لو تو بوری بھر جائے گی —— ہاں زمین کی بات ٹیڑھی ہے۔ آپ

نے بتیس برس پنڈتوں کی خدمت کی ان سے کہیئے کہ مسجد کے سامنے والی ٹکڑی دے دیں

رہی نذر نذرانے کی بات تو دس بیس بار لٹھ لے لیں "

چھوٹے خاں نے تو ایک سانس میں سب کچھ اُگل دیا، لیکن شیخ سر جھکائے

بیٹھے رہے۔ منظو چلم بھر کر لایا۔ حقّے پر رکھ دی، گٹّا دبا کر مہنال باپ کے لبوں تک

پہنچائی۔ تھوڑی دیر تک نگاہ کے اُٹھنے کا انتظار کیا۔ پھر شیخ کو مراقبے میں سوتا پاکر دبے

پاؤں چلا گیا۔ چودھری قاسم نے سینے پر پھیلی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا کھنکار کر

تھوکا پھر بہت چبلا چبلا کر گویا ہوئے۔

" اس سِتم کی بھی کوئی انتہا ہے کہ ہندوؤں کی دش بھِریاں ہیں اور تین سوا سے مسلمانوں

کی ہجار ڈیڑھ ہجار بھریاں ہیں اور ایک مسجد وہ بھی .... ڈیڑھ ہاتھ کی" انھوں نے

اپنے لمبے چوڑے بالشت سے پلنگ کی پٹی ناپ کر بتائی۔ اب منیر بخش کے لئے بولنا فرض

تھا کیوں کہ قاسم سے وہ کم کیسے رہتے۔

" مان پور سے گگراواں والوں کو کبھی لگان کے لئے تکا جا نہیں کرنا پڑا۔ نجر نجرانا

تک ہم پنچ گھر بیٹھے دے آئے ہیں۔ تمری چار پیسے کی پٹی دیر سے پہنچے یا سویر سے لیکن ان

کے پندرہ آنے کی کوڑی کوڑی چکا کر روٹی چھوئی ہے "

تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے گردن اُٹھائی بے نور آنکھوں سے سب کے چہروں

پر لکھی ہوئی ایک سی عبارت پڑھی اور مری مری آواز میں بولے۔

" کل صبح گگراواں جاؤں گا "

صبح جب شیخ قرآن مجید کی تلاوت کر کے اُٹھے تو منظور کی چارپائی خالی تھی۔ ورنہ وہ اُلٹی سیدھی ٹکریں مار کر بڑی دیر تک اینڈتا رہتا تھا۔ رجب کی ماں سے پوچھا اس نے تازی روٹی میں گود گود کر گھی بھرتے ہوئے جواب دیا کہ بھیا بڑی دیر سے باہر گئے ہیں۔ شیخ باہر آئے تو ٹانگن غائب تھا۔ کوٹھری کھولی تو ساز رکھا تھا۔ ہاں لگام غائب تھی۔ شیخ دھک سے رہ گئے۔ صحن میں ٹہلتے رہے اور سورہ یٰسین پڑھتے رہے۔ شیخ ٹانگن کی شرارت جانتے تھے۔ ادھر سوار کی پڑی بگڑی ادھر اس نے پھینکا۔ شیخ جن کی سواری کی جوار میں دھوم تھی ان تک کو یہ ٹانگن پٹخنیاں کھلا چکا تھا۔ اس کی اسی ادا پر تو شیخ ریجھے ہوئے تھے۔ ورنہ اُنھوں نے کبھی ایک جانور پر دو برس سواری نہیں کی۔ وہ سوچتے سوچتے باہر نکل آئے۔ آج اُنھوں نے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا کہ منظور کی پٹائی کر ڈالیں۔ ماں کی موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لونڈے کو دلار میں چوپٹ کر لیا جائے۔ وہ اپنے غصے کو اُبھار ہی رہے تھے کہ ٹاپوں کی آواز آئی۔ منظور ماہر شہسوار کی طرح گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر تصویر بنا بیٹھا تھا۔ ٹانگن دھول کی طرح ان کے پاس سے گزر گیا۔ وہ کوٹھری میں پہنچے۔ ٹانگن پسینے میں شرابور پھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختے اندر پہونچے۔ منظور رجب کی ماں کے کولے سے کولا جوڑے گھی میں ڈوبی روٹیاں کھا رہا تھا۔ اُنھوں نے اُسے چیخ کر پکارا اور صحن میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے کرتے کے دامن سے اپنا منہ پوچھا اور آکر بے نیازی سے بیٹھ گیا۔

"اٹھائیسواں پارہ سناؤ۔"

شیخ کی وہاڑ سُن کر منظور نے نگاہ اُٹھا کر ان کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو بس ریکارڈ بجنے لگا۔ شیخ نے زیر زبر کی غلطی کا بہانہ ڈھونڈھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن کچھ بس نہ چلا۔ پارہ ختم کر کے منظور اُٹھا اور دودھار سے دو کٹورے دودھ نکال کر پانی کی طرح چڑھا گیا۔ شیخ اس کے بدن کی حیرت انگیز اُٹھان دیکھتے رہے اور اپنا غصّہ بلاتے رہے، مگر وہ کسی طرح آہی نہ چکتا تھا۔ مجبوراً باہر چلے گئے۔ اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی اور لُو چلنے لگی تھی کھلیان میں تھوڑا گیہوں پڑا تھا۔ شیخ اُٹھوانے چلے گئے۔ گیہوں تو پڑا رہا البتہ شیخ اُٹھوا کر لائے گئے لُو کے ایک ہی تھپیڑے میں جل کر سیاہ ہو گئے۔

ؒ ؒ ؒ

شیخ کے جنازے پر سارا مان پور رو دیا تھا۔ منظور تو اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ منظور کو اس خوشی کا بھی انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ساری رات مدّی چچا سے کشتی لڑسکتا ہے اور سارا دن ٹانگن پر سواری کر سکتا ہے۔ مڈل اسکول کا بھاری بستہ جو منظور کی بیل کی سی گردن پر گاڑی کے جوئے کی طرح رکھا تھا پرانے سامان کی کوٹھری میں دفن ہو گیا چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کی ہمیل ٹانگن کی گردن میں گنگنانے لگی۔ لگام میں ریشم کی ڈوریاں چمک اُٹھیں۔ اکھاڑے کو وسیع کر کے اس کی مٹی کو ملائم کیا گیا اور مدّی چچا سے منظور کے دو دو گھنٹے داؤں ہونے لگے۔ ٹانگن پہ دس دس میل کے چکّر لگنے لگے۔ مان پور کے اُتّر اور پچھم میں دور دور تک پاسیوں کے گاؤں تھے جو سب آپس میں عزیز دار ہونے کے باوجود لڑتے رہتے تھے۔ ان لڑائیوں کا سبب شکایت سے زیادہ قوت کا اظہار تھا۔ تاہم

یہ وقت پڑنے پر غیر پاسی کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے۔ ان میں سب سے مضبوط سب سے اہم اور سب سے وسیع گھرانا راجپورہ کے راج دین کا تھا جس کے درجنوں بھائی دس بیٹے اور اتنی ہی بیٹیاں .... تھیں۔ ان سب کی شادی بیاہوں نے دور دور تک اس کا اثر پھیلا دیا تھا۔ راج دین لگراواں کا نوکر تھا لیکن جب شیخ گھر بیٹھے تو شیخ کی جائداد کا منتظم ہو گیا۔ راج دین کا چھوٹا لڑکا رام دین منظور کا ہمجولی تھا اور منظور کو "منجو" بھیا کے بجائے "مجو" بھیا کہتا تھا۔ منجو بھیا کا یہ مخفف رام دین نے اپنی آسانی کے لئے گیا تھا جو دھیرے دھیرے مان پور کی زبان پر چڑھ گیا۔ شیخ کے مرنے کے بعد راج دین نے جائداد کے چھوٹے موٹے کام رام دین کے سپرد کر دیئے۔ اس کا بہت بڑا سبب منظور کی شخصیت کی دل کشی تھی۔ جس نے رام دین کے علاوہ جوار کے بہت سے مطمئن گھرانوں کے نوخیز لڑکوں کو فتح کر کے اپنی رکاب میں شامل کر لیا تھا، مان پور، سیتا پور، ہردوئی کے سرحد پر تھا اور تین تھانوں میں تقسیم تھا۔ اس نزاکت سے فائدہ اُٹھا کر جرم کے جائے وقوع میں ذرا سی تبدیلی کر کے ہر تھانیدار اپنا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پولیس والوں کی زبان میں مان پور بنجر بھی تھا۔ روایت تھی کہ فلاں کے باپ نے ڈھکے کے دادا سے دو روپے قرض لے کر پولس کو کسی زمانے میں رشوت دی تھی۔

مان پور کی مفلسی کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی، جس کی بنا پر پولیس یہاں کے واقعات میں دلچسپی بہت کم لیتی تھی۔ مان پور کے دو تھانے لگراواں کے تعلقے میں تھے۔ اور لگراواں کے مختار عام شیخ منصور علی کا وطن مان پور تھا۔ شیخ کی مراعات نے پولیس

کو اخلاقی طور پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مان پور کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ ان حالات نے
مان پور کی نفسیات بگاڑ دی تھی۔ جس لڑکے کے ہاتھ پیر سلوتر ہوتے وہ کسی نہ کسی استاد
کا شاگرد ہو کر بدن بناتا۔ کسی نہ کسی اکھاڑے میں شامل ہو کر بانا گھماتا۔ گلے میں کالا تاگا اور
ڈنڈ پر لال تعویذ باندھ کر سات ہاتھ کی لمبی لاٹھی بغل میں دابتا اور ریے پیے جھوم جھوم کر مٹرگشتیاں
کرتا۔ جب تک باپ چچا روٹی دے پاتے دیتے۔ پھر وہ دو دو تین تین ضلعوں سے بھاگے ہوئے
بدمعاشوں سے یارانہ بڑھاتا کبھی ضرورتاً کبھی تفریحاً ڈکیتی تک میں شامل ہو جاتا۔ جب معاملہ
شیخ کے ہاتھ سے نکل جاتا تو صافے میں کمر بندھوا کر جیل چلا جاتا۔ چھوٹ کر آتا تو "سسرال"
کے قصے سناتا۔ اور دل کو دہلا دینے والے قہقہے لگاتا۔ یہ سب دیکھتے ہی دیکھتے شیخ
کے بال سفید ہوئے تھے۔ اسی لئے جس دن منظور نے استاد منّے کے اکھاڑے میں لکڑی
سیکھنے کی اجازت مانگی۔ اس دن شیخ نے پہلی بار دلار سے منظور کو ڈانٹا۔ قرآن مجید کا سبق
لمبا کر دیا۔ آموختہ دوبارہ سنا۔ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر منشی لال بخش کو سختی کرنے کی
تاکید کی۔ اس فضا میں منظور کا بدن ککڑی کی بیل کی طرح پھیلتا گیا۔ اس کی چھٹیا چونٹیوں
کے دل کی طرح بڑھتی گئی۔ منظور کے بجائے مجّو بھیا کے نام سے وہ مشہور ہوتا گیا۔ اور نو
مولود باغ اور کھیتوں کی آپ ہی آپ نگرانی ہوتی رہی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

صنیوت کا زمانہ تھا۔ گیہوں بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ستاروں کی چھاؤں
میں کھڑے ہوئے مجّو بھیا بیلوں کو بجھڑے کے آٹے کی لوئیاں کھلا رہے تھے اور چکّی پر گاتی

ہوئی پسنہاریوں کے گیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہرواہے نے تانگن کی بیماری کی خبر دی۔ مجو بھیا کی چٹھیا خبر سنتے ہی دوڑ پڑی، چار چار کوس کے دھاوے مارے۔ جوار بھر کے سیانوں کی بھیڑ لگا دی۔ مگر تانگن مر گیا۔ یاروں نے تالاب کے کنارے گڑھا کھود کر اس کی لاش دبا دی۔ چھوٹے خاں کے بیٹے فجو خاں نے ہانک لگائی۔

"فکر نہ کرو مجو بھیا اگلے سال اللہ نے چاہا تو اس کا عرس کریں گے۔"

مگر فجو خاں کی اس آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ مجو بھیا کو سوگوار دیکھ کر کٹہریوں کے چودھری کا بیٹا بکس اپنا لنگوٹ باندھتا ہوا آیا اور مجو بھیا کے چوڑے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:۔

"تم گھوڑا پسند کر لو بھیا۔"

"ہاں اور تم گھر کے آنگن سے مٹھور کھود کر روپیہ گن دینا..... کیوں نا —؟"

"اور جو مٹھور ہی کھود دیں مجو بھیا تو —"

یہ کہہ کر اس نے ان کو اکھاڑے کی منڈیر پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"مسجد کے پاس جو دس بیگھے کا کھیت ہے۔"

"ہے —"

"اس میں کوئیاں کھود کر آلو بوائے دو...... فصل ہے ابھی۔"

"اول تو کنواں کھودنے میں روکڑ لگتی ہے...... پھر بیا لیسا رہ؟ —"

"کیا یار مجو بھیا باتیں کرتے ہو...... ہم پنچ جیسے مٹی کے مادھو ہیں؟"

اور سارا اکھاڑا اپنے اپنے یاروں کو پکارتا ہوا کھیت میں اُتر پڑا۔ مگدر ہلانے اور ڈنڈیں لگانے کے بجائے سب کے سب پھاوڑے اور کدال لے کر جُٹ گئے۔ شام ہوتے ہوتے پانی نکال لیا۔ دوسرے دن درجنوں بیریاں کھود کر روند دیا۔ تیسرے دن کیاریاں پڑنے لگیں۔ بکّس کے باپ نے کہا بھی کہ دس بیگھے آلو سنبھالنا تماشہ نہیں ہے، لیکن لونڈوں نے ایک نہ سُنی۔ آلو کا کھیت مجّو بھیاّ کی بیٹھک بن گیا۔ جو آتا چلم کا ایک دم لگاتا یا ایک بیڑی سلگاتا اور سو پچاس ڈول پانی کھینچ کر کھیت میں بہا دیتا۔ بسوے دو بسوے کی نکائی کر دیتا۔ بکّس کا باپ بفاتی جس نے فن کاشتکاری کے سائے میں آنکھ کھولی تھی اور داڑھی سفید کی تھی۔ اس کھیت کا نگہبان تھا۔ وہ بوڑھے فنکار کی طرح نکتے نکالتا اور مان پور کی ساری جوان اور قوی ہیکل آبادی اپنا پسینہ بہاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھاگن کا مہینہ آگیا۔ دن سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ کھیت کے سرہانے کھڑے ہو کر مجّو بھیاّ نے دو سیر جلیبیوں پر نذر دی۔ اور یاروں نے دو دو جلیبیاں منہ میں رکھ کر کھرپیاں سنبھال لیں۔ اور پاؤ پاؤ بھر کا آلو کھودنے لگے۔ مجّو بھیا سڑک کے کنارے والی منڈیر پر کھٹیا ڈالے بیٹھے تھے۔ خیالوں کی چاندی کا خیمہ کھڑا کر رہے تھے کہ گراداں کے مختار عام ہاتھی ایسے مشکی گھوڑے کی لگام کھینچ کر کھڑے ہو گئے، مجّو بھیا نے دُعا سلام کا بہانہ بنا کر ان کو گھوڑا دیکھنے کے لئے اُتار لیا۔ بکّس نے کھرپی کھٹیا پر رکھ کر گھوڑے کو گھورا۔

”کمہتار صاحب کتنے میں خریدا،،

”کیا،، مختار عام نے لونڈے کو گھور کر دیکھا۔

"گھوڑے ـــــ"

"گودی بھر گے لگا ہے بجّو ـــــ"

"مگر گن تو لیا ہوگا ـــــ"

"ہاں چھ سو کل ہے ـــــ" اور بکس کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ سن لیا

"بس۔! بڑے سستے ہوتے ہیں گھوڑے اپن نے تو جانا تھا کہ ہجار دو ہجار کا ہوگا"

"تو باندھ لو دو چار ـــــ"

"رسید لکھ گے ...... منگاؤں کاگد"

"اچھا بجّو ...... منگاؤ ...... تم بھی کیا یاد کروگے ..... مگر سوا چھ سو لوں گا ـــــ"

"ہم تو مختار صاحب ساڑھے چھ سو تک دے مرتے ..... مگر اب تو تم بات ہی ہار گئے"

بکس تیر کی طرح گھر گیا۔ ماں کے ازار بند سے کنجی کھولی وہ ہاں ہاں کرتی رہی۔ اور اس نے کوٹھری سے بانس کی پٹاری نکال کر آلو کی گاڑیوں والا روپیہ گننا شروع کر دیا پھر چھوٹے خاں کو ساتھ لے کر پہونچا اور بات کی بات میں پہاڑ ایسا گھوڑا کھینچ کر سنسان کوٹھری میں پہنچا دیا۔ جس کے دونوں طرف دروازوں کے بجائے ٹٹیاں لگی تھیں۔ مجّو بھیا کو اس وقت ہوش آیا جب گھوڑے اور بیپاری کا چکتا ادا کر کے کوئی دو ہزار روپیہ ان کے باپ کی صندوقچی میں جھنجھنا رہا تھا۔ وہ باہری کمرے کے تخت کی کثیف جاجم پر بیٹھے تھے۔ کونے پر رکھی ہوئی لالٹین کی زرد روشنی میں ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دو ہزار روپے کا ڈھیر نور کے پتلے کی طرح ان

کی قلب ماہیت کر رہا تھا۔ اُنھوں نے ایک سچّے مرید کی طرح اس کے ارشادات کو اپنی دل کی گرہ میں باندھ لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بجائے اکھاڑے پر جانے کے انھوں نے اپنے باپ کے وقت کے پھوس ہرواہے طلب کئے۔ ان کو ٹھنڈی آواز میں جواب دیا۔ اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے لمبے چوڑے ہاتھ پیر والے دس نوکر بھرتی کئے۔ ان کو سفید قمیص، نیچی دھوتیاں لال انگوچھے اور چرچرودھے جوتے پہنائے اور شام کو بکس سے ترکاریاں بونے کے فن پر تبادلہ خیالات کیا۔ چھوٹے خاں نے سمجھایا کہ نوکر ایک گاؤں کے ہوتے تو اچھا تھا۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا تھا کہ نوکر غریب گھروں کے ہوں تاکہ داب سہہ سکیں۔ لیکن مجّو بھیّا نے اپنی فہرست پر نظر ثانی نہ کی۔ اور جوار کے اہم ترین، گاؤوں کے اہم ترین گھرانوں کے نوجوان اور سرکش پاسی چماروں کا دستہ برقرار رہا۔ مجّو بھیا ان کے ساتھ ڈنڈیں لگاتے بھگوئے ہوئے چنے کھاتے۔ ان کے غموں میں آنسو بہلاتے۔ ان کی خوشیوں میں قہقہے لگاتے۔ دن گزر رہے تھے۔ کھیت چاندی اگلنے لگے۔ دو دروازوں کی مختصر سی کوٹھری وسیع ہوکر اصطبل بن گئی اور اس میں تین رنگوں کے گھوڑے ہنہنانے لگے۔ نوکروں کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ شیخ منصور علی کے آبائی مکان کی مشرقی دیوار ڈھا دی گئی۔ اور کٹھل کے باغ کی داہنی تک سارا رقبہ گھیر لیا گیا۔ اس میں نئے کمرے بنے، دالان کھڑے ہوئے پھر سارا امردانہ سفید قلعی کے براق کپڑے پہن کر اترانے لگا۔ کوٹھریوں اور کمروں میں بھرا ہوا مردہ فرنیچر رام لکھن بڑھئی کے علاج میں دے دیا گیا۔ جس نے سپرٹ اسپرٹ اور چپڑہ پلا کر اسے زندہ کر دیا اور مان پور کا سب سے بڑا مکان دور سے نظر آنے لگا۔

مجّو بھیا

الوداع کے دن حافظ جھنگا نے بڑی کوشش کی لیکن جمعہ پڑھانے کے لئے مسجد تک نہ آسکے۔ چودھری منیر بخش نے چھوٹے خاں کے کان میں گھُن سے کچھ کہا اور اُٹھ کر بیچ کے در میں بیٹھے ہوئے مجّو بھیا کو ان کے کرتے کی چُنی ہوئی آستین پکڑ کر اُٹھا لیا اور منبر پر کھڑا کر دیا۔ مجّا نے لپک کر اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اپنی پگڑی اُتاری اور مجّو بھیا کے کامدار پلّے پر لپیٹ دی۔ مجّو بھیا نے طاق پر رکھی ہوئی کتاب اُٹھا لی اور ٹھنڈی آواز میں خطبہ شروع کر دیا۔ گویا شیخ کو اموختہ سُنا رہے ہوں۔ پھر مان پور کی کچّی عیدگاہ کے صحن میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بغیر داڑھی کے نوجوان مجّو بھیا کی امامت میں صف آرا ہو گیا۔ چھوٹے خاں نے جب گرج کر تکبیر کہی تو ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے حافظ جھنگا کی بیمار آنکھیں چھلک پڑیں۔ مجّو بھیا نے مان پور اور اس کے جوار کے مسلمانوں کا احترام کیا اور نوجوان درگا سہائے کو چکمہ دے کر مسجد کے سامنے کی ساری زمین اپنی نجی ضرورت کے لئے خرید لی۔ رجسٹری ہوتے ہی اپنی جیب سے مسجد میں پیوند کاری کی طرح ڈال دی۔ درگا سہائے نے یہ خبر سُنی تو آگ ہو گئے۔ پچاس آدمیوں کو چاروں بندوقیں دے کر مان پور چڑھ آئے۔ مجّو بھیا کو سُن گُن مل چکی تھی۔ ایک ہی للکار میں سارا جوان مان پور ڈھاٹے باندھ کر پیل کانٹے سے لیس ہو کر دوڑ پڑا اور مجّو بھیا کے دوارے ان گنت رانوں کی مچھلیاں اور گرم نگاہوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ بوڑھے بوڑھے آدمی چپ سادھے بے قرار قدموں سے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ گاؤں راج کے سامنے پہلی بار مان پور نے سر اُٹھایا تھا۔ تجربے کار ہندوؤں نے بستی کے ڈانڑے پر نیم دائرہ بنا کر ہاتھی کو روک لیا۔ بل کھاتے درگا سہائے گرتی پڑتی حال

بتا کر قانونی اونچ نیچ سمجھائی ان کی چھاتی کے شعلے تو کم ہو گئے ۔ لیکن آگ لگی رہی ۔

شیخ مسرور علی مختار عام کے مرنے کے بعد پہلی بار درگا سہائے مان پور آئے تھے بڑی ہچر مچر کے بعد ہاتھی مجّو بھیا کے چبوترے پر لگا دیا گیا ۔ سپاہیوں کی باہوں پر رکھی ہوئی سیڑھی کے سبک ڈنڈوں پر پاؤں رکھ کر درگا سہائے اتر آئے ۔ مجّو بھیا نے سلام کرکے ہاتھ ملایا ۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دالان میں آئے ۔ ان کو آرام کرسی پر بٹھا کر نئے سیٹ میں برف کا شربت پلوایا ۔ لکھنؤ کے خریدی ہوئی نئی سٹک کی مہنال پیش کی ۔ آم کے بور کٹھل کی فصل اور گیہوں کے بھاؤ پر باتیں کیں ۔ ہاتھی پر چڑھتے ہوئے درگا سہائے نے مجمع کے چہرے پر سرکشی کی ایک سی عبارت پڑھ لی ۔ اور متردد ہو کر چاروں بندوقوں کو عقب میں لئے ہوئے چلے گئے ۔ جب سڑک کی موڑ کے اندھیارے میں ہاتھی کھو گیا تب مان پور کے بوڑھے چہروں پر بحالی آئی ۔ اور جوانوں کے سینے اور پھول گئے ۔ دھیرے دھیرے بستی کے چوپالوں کی عدالتیں مجّو بھیا کے دالانوں میں ضم ہو گئیں ۔ یہاں پٹواری کے کاغذات سے لے کر دیور بھاوجوں کے تعلقات تک درست ہونے لگے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے مان پور کے بنیوں کی بھینسوں کے تھن سوکھنے لگے ۔ دس دس روپے پر دس دس دن میں دو دو پٹے سودا ادا کرنے والے گودی بھر بھر کر روپیہ لے جاتے اور کوڑی کوڑی جوڑ کر ادا کرتے ۔ مگر مجّو بھیا کی تیوری پر بل نہ آتا ۔ بہتوں نے تو مار بھی لیا ۔ لیکن کچہری عدالت کا تو کیا ذکر مجّو بھیا نے منہ سے کچی بات بھی نہ کہی ۔ مان پور ان کو دل سے زیادہ نگاہ کا سچا سمجھتا تھا ۔ گھر میں جب ہیسارہ بنایا جاتا اور عورتوں کے ریوڑ لق ودق آنگن میں مچھٹا بچھیوں کی طرح کلیلیں

کرتے تو وہ کمرے میں لیٹے کڑیاں گنا کرتے سنسناتی دوپہروں میں جب ڈھور ڈنگر تک اپنے
تھانوں پر یا درختوں کے سایوں میں جگالی بھول کر آنکھیں میچ لیتے تو ان کے ہاہاہو ہو کرتے
مکان میں رجب کی اماں کی سبک سجل پوتیاں نواسیاں لچھے توڑے نچایا کرتیں۔
پاس پڑوس کی ...... آنکی بانکی ترچھی مانگی بیاہی عورتیں کھلے ڈھکے سے بے نیاز مجّو بھیا
کو دودھ پیتا سمجھ کر ٹھٹھے لگایا کرتیں۔ چھیڑ چھاڑ کر کے وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ رجب کی
اماں گالیوں کا آموختہ سنانے بیٹھ جاتیں۔ مگر مجو بھیا مورتی کی طرح بیٹھے رہتے۔ جون
جہاں مجو بھیا انگن میں دھم دھم کرتے آتے تب بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔
عورتیں اپنے جونک ایسے بچوں کو دودھ پلایا کرتیں۔ گھٹنوں کی اندھوریوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے
پنڈول کا برادہ چھڑکتی رہتیں۔ کوئی بڑا لحاظ کرتی تو پاس پڑا ہوا موٹا موٹا دوپٹہ اٹھا کر پٹیوں
سے گوندھے ہوئے سر پر ڈال لیتی۔ بہت سی تو اس کی بھی زحمت نہ کرتیں۔ کالے خاں
کی گوری دولہن موٹی موٹی لال لال برتوں پر لگانے کے لئے آنبا ہلدی لینے آئی،
رجب کی اماں ابھی ڈبے ٹٹول رہی تھیں کہ بھیا آگئے۔ وہ اٹھی اور راستہ روک کر کندھوں
تک اپنی کرتی الٹ دی اور برتیں دکھلا دیں۔ بھیا کنواریوں کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑے
اس کی شکایت سنتے رہے اور چلے گئے۔ سڑک کے کنارے جوان عورتوں کو گھاس چھیلتے
دیکھ کر وہ سایہ چھوڑ دیتے اور چلچلاتی دھوپ میں بھنتے چلے آتے۔ اپنے باغ میں عورتوں کو
اٹکھیلیاں کرتے دیکھ کر دور ہی سے واپس چلے آتے۔ یہ سب کچھ تھا مگر حاجی میٹھے کی دولہن
للّی کو دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکن بگڑ جاتی۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگتا اور وہ اس جادو کو اپنے

سر سے اتار پھینکنے کے لئے لنگوٹ باندھ کر ہزار پانچ سو ڈنڈ نکال دیتے۔ گھوڑا کھینچ کر دس پانچ میل کا چکر لگا ڈالتے پھر بھی چین نہ آتا تو چار چھ بالٹیاں سر پر انڈیل لیتے۔

حاجی میٹھے گھوڑے بیل کے تو حکیم تھے ہی۔ حج کے بعد معلوم نہیں کس سادھو نے کون سی بوٹی بتا دی کہ وہ برص کا علاج بھی کرنے لگے۔ پہلے پہل تو لوگوں نے ٹھٹھول جانا لیکن منّا دھوبی کے بھلے چنگے ہوتے ہی قادر........ نے آنکھیں جھپکائیں اور ایک دن مسجد سے نکلتے ہی حاجی کو پکڑ لیا۔ اٹھارہ بیس سال کی جوان جہان للّی نے اپنا پیٹ اور کمر کھول کر دکھا دیا۔ دھبے دیکھ کر جواب میں حاجی نے قادر کی آنکھو میں آنکھیں ڈال دیں۔

"چالیس دن لگیں گے۔"

اور قادر کی آنکھوں میں تشکر مسکرانے لگا۔ ابھی بیس بائیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ للّی کے گال کا داغ بجھنے لگا۔ چیت کی تپتی دوپہر تھی۔ للّی کھانا کھا کر کوٹھری میں گئی کہ لیپ لگا کر لیٹ رہے۔ مگر ٹین کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ باہر آئی تو باپ خرّاٹے لے رہا تھا۔ ماں پڑوس میں گئی تھی۔ مجبوراً ڈبہ پکڑے پکڑے حاجی کے گھر چلی گئی۔ بروٹھے میں پیڑھی پر حاجی بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ چارخانے کے تہبند سے نکلی ہوئی بانس کی پنڈلیوں پر چیونٹیوں کی طرح کالے کالے بال لسے ہوئے تھے۔ کالی داڑھی سینے کی ہڈیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ حقہ پینے میں ان کا پیٹ لہار کی دھونکنی کو منہ چڑا رہا تھا۔ املی کے بیجوں جیسی آنکھیں اٹھا کر انھوں نے للّی کو دیکھا۔ بائیں گال کو غور سے دیکھا، لیکن دھبہ نظر

نہ آیا۔ سرخ گالوں پر لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے چھپتی ہوئی بغیر کاجل کی کالی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ سنسنا گئے۔ حاجی کی نظر جھک گئی، لیکن پھر اُٹھ کر للّی کے کولھوں پر پھنسی ہوئی کرتی سے لٹک گئی۔ حاجی میٹھے کے وجود کے اندر چھپا ہوا مرد آج کلثوم کی موت کے بعد پہلی بار ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ حاجی نے خنک ہوتے ہوئے گلے کو دھوئیں سے ایک بار تر کر کے حقہ ہٹا دیا۔

"وہاں تروا ہے میں دوا کا مروا دھرا ہے۔"

حاجی نے آہستہ سے کہا اور کالے لہنگے کی گوٹ سے بیزار سفید پنڈلیوں کا رقص دیکھنے لگے۔

"ملا ناہیں۔"

"ناہیں۔"

حاجی اپنے مرتعش وجود کو گھسیٹتے ہوئے۔ تروا ہے کے پیچھے والے کمرے میں گھس گئے۔ مروا اُٹھا کر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"لے۔"

زندگی میں پہلی بار للّی کو انجانا میٹھا میٹھا خوف محسوس ہوا۔ لیکن وہ چلی گئی۔ جیسے وہ مرعوب سے لال آلو کھانے کے لئے چوزے سے کٹا منہ کھول رہی ہو۔ حاجی نے کالی کالی دوا سے بھری ہوئی انگلی اس کے بائیں گال کے پھول پر لگا دی۔ لگاتے رہے۔ وہ کھڑی رہی جیسے نٹ رسّی پر کھڑا ہوا۔ پھر حاجی نے اس کی کرتی

کا دامن بائیں ہاتھ کی چٹکی سے پکڑ لیا۔ اور للّی کو ایسا لگا جیسے لال لال سلاخیں اس کی کمر سے چھو گئی ہوں۔ وہ چھلاوے کی طرح تڑپ کر کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"دوا ڈبے میں دھر دیو۔"

"للّی۔"

حاجی کی آواز کے ارتعاش نے خود ان کو چونکا دیا۔ للّی نے وحشی آنکھیں اٹھا کر ان کو دیکھا۔

"تمہاری چھوٹی بہن کی گود میں چار لڑکے ہیں..... اور تمہارے ابھی ہاتھ تک پیلے نہیں ہوئے...... تم بڑی پیاری ہو.... لیکن کون باپ اپنے آٹھ برس کے بیٹے سے تم کو بیاہے گا...... تم کو جھلے گا..... وہ بچا ہو گا..... تو بوڑھا میں بھی نہیں ہوں للّی...... پھر کوڑھ کی دوا..... چالیس دن کی نہیں ہوتی...... چالیس برس کی بھی نہیں ہوتی..... عمر بھر کی ہوتی ہے..... عمر بھر کی..... مان پور میں کون مائی کا لال ہے جو عمر بھر کا پھوڑا اپنے ہاتھ سے اپنے کلیجے پر باندھ لے گا..... میرے لڑکے ہیں نہ بالے.... نہ گوشت روٹی جڑتی ہے... اور نہ جینا چاہتا ہوں۔ بولو للّی۔ بولو ہے نا؟"

حاجی بڑھتے ہوئے چلے گئے۔ دوا والی انگلی تہبند میں پونچھ لی۔ پھر للّی نے محسوس کیا کہ حاجی کی داڑھی کے کائے کالے بال اس کے گریبان میں گڑ رہے تھے۔

پھر ایک جمعہ کو قادر نے للّی کو پانچ کپڑے اور سات برتن دے کر حاجی میٹھے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ شادی کے بعد للّی جو باہر نکلی تو مان پور چونک پڑا۔ لوہے کی بالٹی پر سونے

کی قلعی ہو گئی تھی۔ سارنگی کے تاروں کی طرح کسا ہوا انگ انگ بجنے لگا تھا۔ جب میٹھی
لوکیوں کا جھوا سر پر رکھ کر جب وہ تھرکتی ہوئی بازار میں پہونچی تو دور دور تک دلوں
نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ بکس کو یقین نہ آتا کہ یہ قادر بھوپھا کی وہی لونڈیا للّی ہے جس کے
ہاتھ کی چلم پیتے ابکائی آتی تھی۔ للّی کے مہندی لگے ہاتھ اس وقت تک ناچتے
رہے جب تک جھوّا دیکھنے والوں کی چھاتیوں کی طرح خالی نہ ہو گیا۔ حاجی میٹھے
پھونک پڑے۔ ایک دن للّی نے حاجی کے سر سے جھوّا اتروایا۔ اس میں سے مارکین
کا ٹکڑا گر پڑا۔

"یو کا ہے حاجی؟"

"تیری شلوار کے لئے لایا ہوں ...... لنگا کرتی بڑا ننگا پہناوا ہے۔"

"ہوں"

"للّی نے کپڑا اٹھایا اور پاؤں پٹختی ہوئی گئی۔ کپڑا چولہے میں جھونک دیا۔

"میاں جی ..... میں بیاہ کے آئی ہوں نہ پتریا ہوں نہ لونڈی۔"

حاجی اپنی چیاں سی آنکھیں جھپکاتے رہے۔ اس دن کے بعد حاجی نے للّی
سے کبھی نہ پوچھا کہ کل تو نے فجو خاں کے گھونسہ کیوں مارا تھا۔ یا بکسّ کے ساتھ تروا ہے
میں بیٹھی دو گھنٹے تک کیا باتیں چہلتی رہی۔ حاجی بازار اور نماز کے علاوہ کسی بات
کو اپنی توجہ کا مرکز نہ سمجھتے تھے۔

یوں تو سارا جوان مان پور ندیدے لڑکوں کی طرح اس کے بدن کو گھورا کرتا۔ لیکن

تراب کی آنکھیں جب اس کی کرتی کے فراز پر پڑتیں تو اس کی جان میں بھنگرے لگ جاتے۔ معلوم نہیں کیوں للّی کو اس کی ننگی نظریں کوئی ذلیل منصوبہ بنتی ہوئی نظر آتیں اس تصور کے آتے ہی اس کی فطری شعلہ مزاجی پر تیل کی دھار گر پڑتی۔ اور وہ حاجی کی کسی بات کسی حرکت کو بہانا بنا کر ان کے ایسے ایسے بکھان کرتی کہ وہ بیچارے کھونٹی سے تسبیح اُٹھا کر مسجد چلے جاتے، یا کھرپی لے کر اپنے کھیت میں جا بیٹھتے۔ مگر اس کی آگ نہ بجھتی اور وہ دوپٹے کی بے نیازی سے بے نیاز پاؤں پٹختی ہوئی تائیں تائیں مجّو بھیا کے پاس پہنچ جاتی۔ مجو بھیا چاہے ڈنڈیں لگا رہے ہوں۔ چاہے کھانا کھا رہے ہوں چاہے بیا بسارنے کا مسئلہ لئے بیٹھے ہوں، چاہے لگام ہاتھ میں لے کر رکاب میں پاؤں ڈال چکے ہوں۔ للّی کو دیکھ کر بد مزاج ماں کے سعید بچے کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کی ہر بات کی تائید کرتے اور نظریں جھکائے جھکائے..... حاجی میٹھے کو ڈانٹنے کا وعدہ کر لیتے۔ اور اپنی ضدی نگاہوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر للّی کی کُرتی سے جھانکتی ہوئی کمر سے کھینچ لاتے۔

بقرعید کا مہینہ ڈوب رہا تھا۔ پہلے پانی کا دن تھا۔ حاجی میٹھے خربوزوں کا جھوّا اُٹھوا کر جمعہ کی وجہ سے جلدی چلے گئے۔ للّی کیان کے جھالے میں باہوں کے خنجر دھو رہی تھی۔ آستینوں کے نیام اُلٹے پڑے تھے۔ کانوں میں جھولتے ہوئے بڑے بڑے جھمکے برا کر اب وہ منہ دھونے لگی تھی۔ کہ اس کی منار کہ مرغیاں زور زور سے کڑ کڑانے لگیں۔ وہ چونک پڑی کہ کہیں منگو...... کی بچھیاں تو نہیں گھس آئی ہیں۔ اس نے

مُڑ کر دیکھا تو دروازے کے پٹ کھلے تھے اس کی دہلیز پر کتّا لیٹا ہوا تھا۔ آنگن میں بورے پر پھیلے ہوئے لال لال مرچے چمک رہے تھے۔ اس کے چبوترے کے برابر منگلو قصائی کے دروازے کے اوٹلے پر تراب بیٹھا ہوا تھا۔ للّی نے اُسے دیکھتا پاکر آنکھیں جُھکا لیں اور ہاتھ سُست پڑ گئے۔ لانبا آدمی اوٹلے پر بیٹھا ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑا ہو۔ دھنّی ایسے ہاتھ پاؤں، دیوار کی طرح چوڑا چکلا تراب سڑک پر راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا تو للّی کو گردن اُٹھا کر اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھنا پڑتا۔ تراب کو وہ کنوارپن میں بھی دیکھ چکی تھی۔ محرم میں بانا گھماتے ہوئے، ہولی میں نقل بناتے ہوئے عیدگاہ کے کنوئیں پر" وضو بناتے ہوئے" لیکن اب تو اسے دیکھتے ہی للّی کا خون کھولنے لگتا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ وہی تراب ہے جسے بھیکم پور کے گدّی گدّیوں کی ناک کہتے ہیں، جس کے ہاتھ پیروں کی باڑھ دیکھ کر گدیوں نے ایک بھینس وقف کر دی تھی کہ تراب دودھ پیئے اور محنت لگائے۔ یہ وہی تراب تھا جس نے دن دھاڑے بھکّا پاسی کی دولہن اُٹھا کر اپنے گھر میں ڈال لی تھی۔ اور میلوں تک پھیلے ہوئے پاسیوں کے گاؤں ٹکر ٹکر دیکھا کئے تھے۔ یہ وہی تراب تھا جس نے منگلو ایسے سرکش کی چاند ایسی دولہن پر چھاپا مار لیا تھا۔ کہنے کو تو منگلو اب بھی کہتا تھا کہ تراب سے اس کی بیوی کی نہیں اس کی خود کی یاری ہے، لیکن مان پور والے جانتے تھے کہ تراب چندہ کے ساتھ کوٹھری کے دروازے بند کر کے کتاب نہیں پڑھتا ہے۔ للّی بیٹھی ہوئی نہ جانے

کب تک یہی الّم غلّم سوچا کرتی کہ چھرّوں کی طرح بڑے بڑے بوند پڑنے لگے۔ اس نے گردن اُٹھا کر بھونرا ایسا سیاہ بادل دیکھا اور نتھنی میں پھنسی ہوئی بالوں کی لٹ درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنے نئے لہنگے اور رنگی ہوئی کُرتی کے خیال سے خربوزوں کا جھوّا اُٹھا کر سر پر رکھ لیا اور دھچکتی ہوئی چلی۔ دو چار ہی قدم گئی تھی کہ حاجی کے چادرے پر نظر پڑی۔ مجبوراً رک گئی۔ چادرے کا اڑوا بنا کر سر پر رکھا اور جھونک دے کر جھوّے کو اس پر دھر لیا۔ دو خربوزے گر بھی پڑے مگر وہ بھیگتی ہوئی اور بھاگتی ہوئی چلی ہی گئی۔ بوجھ کی وجہ سے کھیت کی خندق پار کرنا مشکل تھا اس لئے چکّر کاٹ کر وہ منگلو.... کے دوارے سے نکلی۔ تراب کی بھوری آنکھیں اپنی کرتی پر جمی دیکھ کر اس نے دوپٹہ درست کرنے کی کوشش کی لیکن بھیگی ہوئی زمین پر بھاری جھوّے کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"خربوزے بکاؤ ہیں۔؟"

جیسے شیرے کے ڈھول پختہ سڑک پر لڑھک رہے ہوں

وہ بغیر جواب دیئے تیز تیز قدموں سے نکلی جا رہی تھی کہ ایک فقرہ جوتے کی طرح اس کے منہ پر اور پڑا۔

"اور یہ کرتی والے۔"

وہ جھنجھنا اُٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ جھوّا پھینک کر اس مرتھے کا منہ نوچ لے۔
لیکن کسی نے اس کے جھمکے کے پاس منہ لا کر آہستہ سے کہا کہ للّی یہ نہ فجو خاں سے منہ

نہ بکس...... یہ تراب ہے تراب۔ اس نے زندگی میں پہلی بار یہ گندا فقرہ سُنا تھا۔
حاجی میٹھے حاجی تو تھے ہی لیکن وہ مان پور کی سب سے بڑی برادری کے چودھری
کے بھائی بھی تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ موقعہ بے موقعہ بگڑ کر حاجی کو بیارے
کی کوٹھری میں بند بھی کر دیتی لیکن کسی کی کیا مجال کہ وہ حاجی سے اِس تضحیک آمیز
موضوع پر گفتگو کرتا یا للّی سے اشارتاً کنایتاً بھی ذکر کرتا۔ اس فضا میں پلی ہوئی للّی
تراب کے فقروں کو جھیل نہیں پائی۔ جب پہلی بار اس نے تراب کی جلتی ہوئی نظریں
اپنے بدن کے نازک خطوط پر محسوس کی تھیں۔ تبھی اس نے باتوں باتوں میں بکس
سے ذکر کیا تھا۔ لیکن بکس کو چُپ سی لگ گئی تھی۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ بکس
مان پور کا سب سے بھیڑا اور لڑاکا جوان جس کے بدن میں آگ بھری ہے۔ جس
کا غصّہ برساتی نالے کی طرح چڑھا رہتا وہ ایسی بات پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیسے
بیٹھا رہا۔ وہ سوچتی اور چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح کھولتی رہی۔ ایک بار اس کی نظر
چھینکے پر دھری روٹی کی طرف اُٹھ بھی گئی لیکن آج بھوک کہاں تھی۔ وہ چارپائی توڑتی
رہی۔ حاجی نماز پڑھ کر آئے اور جھوا تراز و لے کر بازار کو چلے بھی گئے۔ مگر وہ چارپائی
توڑتی رہی۔

"حاجی چچا...... ہوت"
للّی دلارے پاسی کی آواز سن کر بجلی کی طرح اُٹھی ہاتھ چارپائی کے پچوے پر
جھولتے ہوئے دوپٹے پر خود بخود پڑ گیا۔ لیکن اس نے اسے چھو کر چھوڑ دیا۔ اور بڑے

لاڈ سے بولی :-

"کون دلارے ..."

"ہاں چچی ...."

"چلے آؤ"

رام دین دلارے کا چھوٹا بھائی مجو بھیا کا نوکر تھا۔ اور مجو بھیا للی کا کچھ ایسا احترام کرتے کہ دلارے بھی رام دین کی طرح للی کے چمچماتے منہ پر آنکھیں نہ گاڑ پاتا۔ ویسے دل اس کا بھی للی کو دیکھ کر دھڑک اٹھتا تھا۔ آج للی کی آواز میں گڑ کی مٹھاس پا کر وہ بھونچکا ہو گیا۔ پھر اپنی گولے دار لاٹھی دروازے کے کواڑ سے ٹکا کر مٹیالے جوتے بھیگے آنگن پر ہولے ہولے دھرتا ہوا چھپر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

"تم تو ایسا منہ لٹکائے کھڑے ہو جیسے دولہن بھگا کی نائیں تمری اٹھائے لی گئی"۔ دلارے نے چھاتی کھجلا کر آنکھیں جھکالیں۔

"چچی تم سے یہ امید ناہیں رہے ...... کل اب تم ہوں جوتے مارے لگیو"۔

"جب تک تر آپ جیت ہیں جب تک جوتے مارے والی بات ہے یا......
...... کے دلارے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہدیو ...... کہ نائیں ہے"۔

"ہے ...... چچی ...... گلے گلے پانی مان ہے"

"کیسے آئے ہو ــ ؟"

"آیئن کا ...... تنی ادرک چھی ہے ...... ہے ؟"

"ہاں ہے کاہے نائیں"

اور کونے میں دھری ناند کی بھیگی بالو میں ہاتھ ڈال کر ادرک کی گانٹھیں نکال لیں۔

اور دلارے کے حوالے کر کے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دلارے جس کی نگاہوں کی گرفت اس

کے بدن پر سخت ہو گئی تھی ادرک پکڑ کر چونک پڑا۔ للّی نے بالو سے بھرے ہوئے ہاتھ

اپنے داہنے گھٹنے پر باندھ لئے۔

"دلارے اب کہ جمنی نائیں کھیلیو"

"جتنی کھاؤ..... منن جمنی ہیں"

"تو کھیلیو...... اچھا کہاں کی کھیلیو؟"

"تم چچی جہاں کی بتاؤ..... وہاں کی ان دی جائیں"

دلارے مزے میں آگیا تھا۔ للّی کے مسکراتے ہونٹ اور بولتی ہوئی آنکھیں

دیکھ کر مجّو بھیا کا سایہ اس کے سر سے غائب ہو گیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اور ضرورت

سے زیادہ جھک کر للّی کے لہنگے پر بالو کی انگلیاں جھاڑ دیں۔ للّی کے گھٹنے پر ہاتھ پڑتے

ہی دلارے کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے برف کی استری کر دی۔ اور پسینے میں ڈوبی ہوئی

للّی کی خوشبو اس کی ناک میں آئی۔

"کمھن والے درخت کی جمنی لاؤ دلارے تو ہم جانیں کہ چچی کا بھتیجہ بڑا مرد ہے"

دلارے نے سیدھے ہو کر چچی کی کرتی سے جھانکتی ہوئی کمر کی دھار دیکھی اور ہاتھ کے

گوپھے میں ادرک کی گانٹھیں سنبھالیں۔

"لائب..... چچی لائب"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑا۔ ابھی وہ آدھے آنگن ہی میں تھا کہ للّی نے کہا:

"کہیں تراب تمہاری دلہن نہ اٹھالے جائے۔"

دلارے نے گھوم کر للّی کو دیکھا، ایک منٹ کے لئے ٹھٹکا اور دھم دھم پاؤں رکھتا چلا گیا۔

مان پور میں داخل ہونے والی سڑک کے دونوں طرف ایک قطار میں سب سے پہلے قصائیوں کے مکانات تھے۔ جہاں سے گزرتے ہوئے ادھوں کے بیل ڈنڈک اٹھتے تھے۔ آخری مکان منگلو کا تھا۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکان کی دیوار مشترک تھی۔ اس دیوار میں دروازہ بھی مشترک تھا۔ جسے للّی عموماً بند رکھتی۔ لیکن منگلو کی بیوی چندہ یوں تو سارے مان پور کی سڑکیں کچی کرتی تھی۔ لیکن للّی کے پاس جانے کے لئے وہ ہمیشہ دروازہ کھلواتی تھی۔ منگلو اور حاجی میٹھے کے مکان کے سامنے پھیلے کے کھیت تھے۔ ان کھیتوں نے ہی تراب اور چندہ کی محبت کو جنم دیا تھا اور ان کا راز بھی فاش کیا تھا۔ تراب رات کے اندھیرے میں انھیں کھیتوں کو روندتا ہوا چندہ کی چاندنی لوٹنے جایا کرتا تھا۔ صبح جب حاجی میٹھے پھوٹی ہوئی لوکیوں کو دیکھتے تو نوکر پر بخار اتارتے۔ نوکر نے بڑے جتن سے تراب کو پکڑا۔ لیکن تراب کو ہاتھ لگانا تو درکنار الاہنا دینا بھی مصیبت بن سکتا تھا۔ نوکر بے چارہ چپ رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حاجی بھی چپ ہو رہے۔ مگر قصائیوں کے ساتھ ساتھ کبڑیئے

بھی تراب کے وجود کی دھمک محسوس کرنے لگے تھے ۔

آج صبح پٹیا پانی برسا تھا ۔ للّی کا سارا چھپر تالاب بن گیا تھا ۔ پانی تھم چکا تھا لیکن وہ کونڈا لئے پانی اُلیچ رہی تھی کہ چندہ نے دروازہ بھڑبھڑایا ۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا اور مُڑ گئی ۔ بیچ آنگن میں اُسے " چھن چھن " کی آواز سُنائی دی ۔ اس نے مُڑ کر دیکھا تو ایک ہاتھ سے چندہ نے اپنی شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک اُٹھائے ہوئے تھے جس پر کڑھے ہوئے ہرے ہرے پھول اس کی گندمی پنڈلیوں پر بڑے اچھے لگ رہے تھے ۔ پھر اس کی نظر اس کی نئی جھانجھوں پر پڑی اب تو وہ ٹھٹھک گئی ۔ چندہ اپنے بھاری بدن کو سنبھالے ہوئے بڑے ٹھسّے سے اس کے برابر آگئی ۔ اور للّی نے اپنے دل میں کہا ۔ " تو تراب نے جھانجھیں بنوا ہی دیں بے چاری کو "

" چندری میکے سے آئی ہے "

للّی نے اس کی لہریا چندری دیکھ کر کہا ۔

" اور ناہیں تو منگلو بنوائے دیہیں "

" ای رومال میں کا ہے ؟ "

" پھلیندے "

اور چندہ نے رومال کھول کر ڈلیا میں اُلٹ دیا ۔ للّی نے کونڈا رکھ کر کھڑی ہوئی چارپائی بچھا دی ۔ چندہ نے کاجل لگی آنکھیں مٹکا کر اسے دیکھا اور بیٹھ گئی ۔

پھلیندے تو مکھن والے پیڑ کے ہوت ہیں...... ای تو سب جمنی ہیں.....
... جے پور کے پاسی خوب ہیچت ہیں..... تمرے لئے تو تر آب لائے ہو ہیں۔ ہم پوں
منگوا ہے اب کی "

"میرے لئے کاہے لاتے..... لاتے تو منگلو کے لئے لاتے..... پھر تر آب
کوئی جمیندار ہیں..... او پیڑ تو مجّو بھیا کے اے لیسین کا ہے "

"ہو ہیں بھیّا... ہم کا کا کرے کا..... ہم کا تو مول کی کھائے کا ہے "

للّن نے مسکرا کر جمنی کی ڈلیا اُٹھا کر کھٹیا پر رکھدی۔ اور اپنے ہونٹوں پر مغرور
مسکراہٹ کی سرخی لگالی۔ چندہ بڑی بے چینی سے سورج ڈوبنے کا انتظار کرتی رہی۔
مغرب کی اذان ہوتے ہی اس نے منگلو کو کھلا کر اپنا پاپ کاٹ لیا۔ پھر منگلو کا پلنگ
اُٹھا کر چبوترے پر ڈال آئی۔ منگلو چھپّر کے نیچے بیٹھا ہوا اُسے دیکھتا رہا، اور کلّی کرتا
رہا۔ جب دری تکیہ رکھ کر کوٹھری میں پھر گئی تو منگلو بلّی کی طرح دبے پاؤں دروازے
تک رینگ گیا۔ چندہ کو نئے آئینے میں اپنا منہ دیکھتے پا کر وہ بے قرار ہو گیا۔ اور بھیڑیے
کی طرح جھپٹ کر اس نے پیچھے سے اس کی چٹیا پکڑ لی۔ اور دھم دھم دو گدّے اس
کی پیٹھ پر جھاڑ دیئے۔ پھر اس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ چندہ تھوڑی
دیر تک دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھے ہوئے جھلکتی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھورتی رہی، پھر چھن
چھن کرتی ہوئی نکلی اور باہری دروازے میں کنڈی لگا کر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔
ابھی عشاء کی نماز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انتظار کرتے کرتے چندہ کی جان پر آبنی تھی۔

خدا خدا کر کے دھما کا ہوا اور آدمی بھر اونچی دیوار پھاند کر ترآب آ ہی گیا۔ چندہ کے پلنگ پر بیٹھتے ہی پٹی جُھک گئی۔

"سب خیر ہے"

اس نے اپنا پستول تکیہ کے پاس رکھ کر چندہ کے کورے پیالے سے گالوں کو دبوچ لیا۔

"تم بڑے بے ایمان ہو" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"کا ہے" بھوری بھوری مونچھوں کے نیچے پیلے پیلے دانت چمک اُٹھے۔

"ترے کوئی پھلیندے کا بروا ہے؟"

"ہے"

"اور تم آج تک ناہیں کھلایو..... ترے بروا میں پھائیں ناہیں ہے"

"پر سال ای فصل ماں تم کہاں ہلی رہو..... اب پیٹ بھر کے کھایو۔ پیٹ بھر کے باٹیو"

"ہوں پیسیے سب توڑے بیچے ڈارت ہیں..... ہم کا پیٹ بھر کے جرور کھلیبا"

"ارے او کا کوئی چھوئی ناہیں سکت ہے"

چندہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن ترآب سے مجبور ہوگئی۔ چندہ کے جی کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔

"یہ پڑوسن تمری بڑی جالم ہے"

تراب نے چندہ کی جھانجھ سہلاتے ہوئے کہا۔"

"تم بلاوجہ پڑے ہو اُو کے پیچھے اُو کے کوڑھ ہے۔۔۔ نہیں تو حاجی میٹھے کے پٹے کا ہے بڑھتی کوئی جوان جہان نہ جڑ جاتا۔"

"اب نائیں چندہ۔۔۔ اب تا ہیں ہے او کے کوڑھ۔۔۔ اور چندہ تم اگر ساتھ دے جاؤ تو میں اُی کا۔ مان توڑ کے رکھ دیوں۔"

"تو کا میں کوئی باہر ہوں۔"

اور یہ رات للّی پر بڑی بھاری گزری۔ حاجی میٹھے عشاء کی نماز کے بعد آنگن میں ٹہل ٹہل کر تسبیح پڑھتے رہے۔ پھر اپنی چارپائی پر کورے گھڑے کا پانی بہا کر لیٹ رہے اور خراٹوں میں ڈوب گئے۔ مگر للّی تڑپتی رہی۔ تراب کا فقرہ بھرجی کے موسل کی طرح اس کی چھاتی پر چلتا رہا اور وہ تڑپتی رہی۔ ابھی اندھیرا تھا کہ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس نے اپنی چارپائی پر آدھے لٹک کر حاجی کو جھنجھوڑا جو کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ چھپر کی الگنی سے کرتا، طاق سے دتون اٹھا کر ٹوپی دیتے ہوئے نکل گئے۔ کڑکڑاتی ہوئی مرغیوں کے جھوئے کی سل اُٹھاتے ہوئے ایک خیال نے للّی کے ذہن پر چٹکی لی اور وہ بڑی تمکنت سے چارپائی کے سرہانے سے ڈوپٹہ اُٹھاتی ہوئی باہری دروازے پر آگئی۔ صبح کا دودھیا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خنک ہوا مٹی اور درختوں کی خوشبو سے بوجھل تھی وہ سدھائی ہوئی ہرنی کی طرح پگڈنڈیوں پر اُڑتی ہوئی مجّو بھیا کے بار میں آ گئی جس کی دانتی پہ کٹھل کا باغ تھا۔ اس میں درخت تو کم تھے۔ لیکن رقبہ بہت تھا اور اس کی گھاس

بھیکم پور والوں نے اپنے جانوروں کے لئے خرید لی تھی۔ اس کے پاس ہی مجّو بھیا کی اوکھ کی پیڑی تھی۔ وہ اس کھیت کی مینڈ پر آ کر بیٹھ رہی گھروندوں کی طرح دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ اُجالا اور بڑھنے لگا۔ اکّا دکّا آدمی کھیتوں میں دکھائی دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بھینسوں کا ایک غول طلوع ہوا۔ للّی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھینسیں ڈکراتی ہوئیں گھنٹیاں بجاتی ہوئیں آہستہ آہستہ چلی آرہی تھیں۔ جیسے موٹی عورتیں چہل قدمی کرتی ہوں۔ پھر یہ غول باغ میں داخل ہو گیا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے آتا ہوا لڑکا ان کو ڈانٹ کر اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے جس طرف سے آیا تھا اُسی طرف چلا گیا۔ للّی آہستہ سے اُٹھی اور گھات لگاتی شیرنی کی طرح جھکی جھکی چلتی رہی باغ کی خندق کے پاس ہی سے اس نے بھینسوں کو کنکر مارنے شروع کئے۔ سب سے بڑی "مندراجی" بھینس کے آگے چلتے ہی سب کی سب اس کے پیچھے ہو لیں۔ للّی ان کو گھیرتی ہوئی مجّو بھیا کی اوکھ میں لے آئی جب ساری کی ساری کوئی بیس پچیس بھینسیں کھیت میں بھر گئیں تب وہ ہرنی کی طرح نپے تلے قدم رکھتی ہوئی اپنے کھپانے کی طرف ہولی۔ تھوڑی دور پر اس کو رام دین نظر آیا۔ جو دوسرے نوکروں کے ساتھ مجّو بھیا کی ڈیوڑھی پر جا رہا تھا۔

"کون رام دین؟"

"ہاں۔ ! یہ تو بچی ہیں..... کہاں سے سبیرے سبیرے"

"میں تو سُنے رہوں کہ پیسے بڑے نمک حلال ہوت ہیں۔ اور مجّو بھیا تو تم پچین پر جان چھڑکت ہیں۔"

"تو ہم کون نمک حرامی کے ڈارا ۔"

"رام دین نے کندھے سے لاٹھی اتار لی ۔ اوبہ چی کے کڑے تیوریوں کو بھانپنے لگا ۔
دوسرے نوکر بھی تھم گئے ۔

"یوں تو میں جانت ہوں کہ جان سب کا پیاری ہے ۔ اور گدّن کا سامنا ایسے بیچارے
کر پاتے تو راج دین کے گھرانے کی ناک کاہے کٹتی ۔ مل اگر تم بھینسن ہانک آؤ تو گدّنی
کچھ توپ تو لگائے نا رہیں ...... اب بھیا بچیرُو تو بھینسن ہانکے آوے سے رہے "۔

"کون بھینس ..... کہاں بھینسیں ؟ "

رام دین کی آواز میں گرمی آگئی اور نوکر بھی چوکنا ہوئے ۔

پیچھے گھومو ...... میں کہت ہوں پیچھے گھوم کے دیکھو ..... اوی بھینسیں ہیں
کوئی چیونٹی تو ہیں نائیں کہ دکھائی نہ دیں "

رام دین نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجّہ بنایا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی گھما کر دوڑ پڑا ۔

"اوہو ...... ای کی بھینسن کی "

اور وہ ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہوئی اپنے کھیلانے کو پار کر کے دروازے پر آگئی "

رام دین جس کا جوان خون للّی کی باتوں نے کھولا دیا تھا ۔ جاتے ہی جاتے بھینسوں
پر لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑا ۔ نوکروں میں سب پاسی تھے ۔ راج پاسی ۔ بھینسیں بدحواس
ہو کر ڈکراتی ہوئی اپنے گاؤں کی طرف بھاگیں تو انھوں نے گھیر کر مان پور کی سڑک پر ڈال
دیا ۔ گدیوں کو خبر لگی تو وہ لاٹھیاں سونت سونت کر دوڑ پڑے اور مان پور کے ناکے پر

بھینسیں روک لیں ۔ رام دین کی گہار سن کر اس کے چچا بھتیجوں کے ساتھ سارا راجپورہ دوڑ پڑا ۔ راجپورہ کی گہار پر مان پور کا بھگا جس کی بہن دلارے کو بیاہی تھی اور جس کی چھاتی گدّی کا نام سنتے پھٹتی تھی ۔ ایک ایک آدمی بٹور کر چڑھ دوڑا ۔ گدّیوں نے لین ڈیوڑی چلتے جو دیکھی تو مصالحت پر اتر پڑے ۔ مان پور نے جو یہ گڑبڑ سنی تو استاد مدّی کے اکھاڑے والے بکّس اور فجو خاں کی چھٹیاں والے بانا گھماتے اور بلم بلاتے نکل پڑے ۔ بوڑھا راج دین کیا جوار کے سارے پاسی نامی پاسی تراب کے لئے بارود بچھائے بیٹھے تھے ۔ لیکن ایک تو گدیوں کی طاقت کا اندازہ تھا پھر مان پور کا خوف تھا کہ یہ پانچ چھ ہزار کی بستی جس طرف ٹوٹ پڑی وہاں کھلیان لگ جائے گا ۔ لیکن آج راج دین دیکھ رہا تھا کہ مجّو بھیا کے نام پر لاٹھی اٹھانے والے پاسیوں کے سامنے مان پور کی چھگڑی تک نہیں پھٹکے گی ۔ اس نے آتے ہی آتے تراب کے باپ پیرا کو للکارا ۔

"تاؤ ..... ہم بھینسیں پکڑا ہے ـــــ ہم ان کا کانجی ہاوس میں بند کر دیا ...... تم وہاں سے چھڑائے لیو ...... ہم سے اگر چھیننے کی بات کریو تو پھر فوجداری ہے ۔ یو تم جانت ہو کہ فوجداری فوجداری ہے ، ای مالڈو ناہیں بٹت ہیں ۔"

راج دین کی گرمی دیکھ کر تراب جو سڑک کے کنارے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا ... مینار کی طرح کھڑا ہو گیا ۔

" ای گدّن کی بھینس ہیں راج دین ۔"

"ہاں ..... اور لپیسیے لئے جات ہیں"

"تو پھر لئے جائیں"

"یا بات ہے .... تو سنبھل جاؤ"

راج دین نے کندھے پر پڑا ہوا چادرہ کھینچ کر سر پر باندھنے کے لئے رکھا ہی تھا کہ مجو بھیا کا مشکی گھوڑا مجمع کو کائی کی طرح پھاڑتا ہوا راج دین کے سر پر کھڑا ہو گیا مجو بھیا سفید کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"کیا راج دین گڑبڑ کرتے ہو"

"کتھا آپ سن چکے ہو"

"ہاں گدّیوں کے یہاں چارہ نہیں ہوگا ..... تمہارا کھیت چرا لیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا ..... کیا یہ لوگ اپنی بھینسیں مروا ڈالتے راج دین"

"بھیا"

اوکھ کے چار اگوروں کے لئے چالیس آدمی نہیں مارے جاتے ..... لے جانے دے ان کو بھینسیں"

"پیرا"

"کہیو"

"کٹھل کے باغ میں بھینسیں نہیں آئیں گی اب"

یہ کہہ کر انھوں نے گھوڑا موڑا جو ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

مان پور اور اس کے جوار کے ایک ایک دل میں مجّو بھیا کی شرافت، لیاقت اور انسانیت کھونٹے کی طرح گڑ گئی۔ راج دین اور بھگا بڑی دیر تک چھپّر میں بیٹھے خاموشی سے چلم پیتے رہے۔ شکار ان کی لاٹھی کی زد پر آکر نکل گیا تھا۔ للّی نے یہ خبر سُنی تو مُنہ لٹک گیا۔ محرم کی پہلی تاریخ تھی وہ پہننے کے لئے ہری کرتی رنگ رہی تھی۔ کرتی نچوڑ کر اس نے الگنی پر لٹکا دی۔ لیکن پھر اس سے اُٹھا نہ گیا۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی دست پنے سے زمین کھودتی رہی۔

⁂

مجّو بھیا زمیندار کے پوت تھے، آج کا نقشہ دیکھ کر غرور سے ان کی چھاتی چار انگل اور بڑھ گئی تھی۔ تراب کے بات کرنے کا انداز ان کو کبھی اچھا نہ لگا۔ وہ واحد آدمی تھا جو ان کے دروازے کے سامنے سے سانڈ کی طرح جھومتا ہوا نکل جاتا۔ کبھی دو انگلی اُٹھا کر سلام کا بھی روادار نہ ہوتا۔ پھر تراب کی بھینسیں اکثر ان کے ہار میں دندناتی ہوئی گھس پڑتیں۔ بظاہر تو وہ کوئی خاص توجہ نہ دیتے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ حرکتیں ان کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مجروح کرنے کے لئے سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں۔ پھر ہولی والے دن تو تراب نے کھل کر نوکروں سے کہہ دیا تھا کہ بڑے شیخ کے بیٹے ہوں تو ہانک دیں آکر تراب کی بھینسیں۔ مجّو بھیا خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ آج انھوں نے جو کچھ کیا تھا۔ اس میں ان کی حکمت عملی کا ہی دخل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر فوجداری ہو گئی تو میں ایک فریق بن جاؤں گا۔ اور قتل کے

مقدمے میں فریق کے معنی ان کو اچھی طرح معلوم تھے اسی لئے وہ طرح دے گئے۔ مگر ایک بات انھوں نے طے کر لی تھی۔ بھیکم پور اور مان پور کی سرحد پر ان کا ایک جوار کا کھیت تھا۔ جس کی مینڈ تراب کے کھیت کو ان کے کھیت سے جدا کرتی تھی اسی مینڈ پر جامن کا وہ درخت تھا جو اپنے مزے کی وجہ سے سارے علاقے میں کھن والے درخت کے نام سے مشہور تھا۔ پیڑ پٹواری کے کاغذات میں بھی مجّو بھیا کے نام درج تھا لیکن جس دن سے مجّو بھیا نے اپنا کھیت راج دین پاسی کو بیسر بجانے کی خدمت کے صلے میں دیا تھا اس دن سے اس کے جامن تراب نے ہتھیا لئے تھے۔ جامن کون ایسی نعمت تھی جن کے لئے مجّو بھیا کڑھتے لیکن یہ ان کی حقیّت اور حکومت کا سوال تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ بیڈھب تراب کے سامنے ان کے مٹھی بھر نوکر گیا کر لیں گے۔ آج پاسیوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دیکھ کر ان کو اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھانے کی سوجھ گئی تھی۔ وہ اپنے باہر صحن میں گملوں کے گول دائرے میں آرام کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ آسمان پر کالے کالے جامنوں کے کھلیان سے بادل لدے کھڑے تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ محرم کے سلسلے میں تھانے سے آئے ہوئے کانسٹبل کی خوراک حلوائی کو بھجوا کر وہ بیٹھے تھے۔ سارے نوکر اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ رام دین ان کی پشت پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا کہ راج دین بھگّا اور دلارے آ گئے۔ سبھوں نے جھک کر سلام کیا۔

"آؤ میتا۔"

اور ان تینوں آدمیوں نے اپنے جوتے اتارے اور گول دائرے میں مجّو بھیا کے

پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"رام دین!"

"ہاں بھیّا"

جب وہ اُٹھ کر ان کے سامنے آ گیا تو بڑے لاڈ سے جھڑکتے ہوئے مجّو بھیا بولے۔

"ابے یہ تو تیرے باپ ہیں۔ ان کو تو بغیر میرے کہے بیڑی پلا دی ہوتی۔"

"باپ ہوں چاہے چچا ہوئیں ..... بیڑی کوئی پیڑن میں تھوڑے لگت ہیں جو ہم بیٹھے لٹاوا کری۔ آپ جیکا حکم دیو اوکا پلائے دیئی۔"

مجّو بھیا نے مسکرا کر راج دین کو دیکھا۔

"مہتیا! تمہارا یہ لونڈا کنجوس ہے ..... بہت بڑا کنجوس ہے ..... تم ایسے دل والے باپ کا بیٹا کیسے ہے یہ۔"

راج دین نے فخریہ اپنے بیٹے کو دیکھا دلارے اور بھکّا بھی ہنس پڑے۔

"کہو بھکّا سب خیریت ہے .... تم کیسے آئے؟"

بھکّا نے سوچتی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر راج دین کو دیکھا اور کھنکارا۔

"اے بھیّا آئے ہیں ایک جرورت سے ..... ہم کا اپنے سنگ لائے ہیں۔"

راج دین نے بہت چبلا چبلا کر کہا۔

"ہاں ہاں بولو"

"اہی اپنا کمرہ بٹوائے رہے ہیں۔ کڑی ادماں پڑ گئی ہیں کم..... تو لکڑی اگر کہوں بگاد ماں ہوئے تو"

راج دین دروازے پر للّی کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ کیوں کہ مجّو بھیا نے گردن گھما کر جو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ وہ سبز ریشمی اوڑھنی کندھے پر ڈالے سبز کرتی کی بہار دکھاتی سبز بڑے کے دار گوٹ کے لہنگے میں بھنور بناتی رانیوں کی طرح آ رہی تھی۔ گملوں کی شاخوں کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے دونوں مرمریں ہاتھ کولہے پر رکھ لئے۔

"کا بھیا کچھ فیصلہ کرت ہیں"

اس نے بڑے ناز سے کہا لیکن بھیّا کچھ بولے نہیں وہ چاہتے تھے کہ بات ختم کر کے یہ لوگ چلے جائیں تو للّی کو غور سے دیکھیں۔

"فقیر نائیں بنے بھیّا آج۔۔؟"

للّی نے پہلی بار آج بھیّا کو اتنی بے باکی سے اپنے سراپے کو گھورتے پایا تھا۔

"رجب کی اماں نے نہ ابھی ٹوپی رنگی نہ کلائی آئی"

بھیّا نے اپنے خشخشی بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ پھر راج دین کی طرف مخاطب ہوئے۔

"بھلّا کو کڑیوں کے لئے لکڑی چاہیئے"

"ہاں بھیّا"

"ہے کہیں نگاہ میں"

"ہمری نگاہ کون.... جہاں آپ حکم دیو وہاں نگاہ دوڑائی جائے"

"ارے راج دین"

"بھیا"

پہاڑ الیسا پیڑ سامنے کھڑا ہے اور تم مارے مارے گھوم رہے ہو..... تمہارے بیسروالے کھیت میں وہ جامن جو کھڑا ہے ــــ دھنیاں ہی دھنیاں ہیں اس میں"

"سانچ تو کہت ہو بھیا ــ"

"بھکّا تم پیڑ کاٹ لیو"

"کاکھن والا پیڑ تم ان کا دیت ہو..... بھکّا کا؟" للّی نے آنکھیں چمکا کر دخل دیا ــ"

"ہاں ــ! کیوں؟

کاہے اپنی آبرو مٹی میں ملاوت ہو..... جو اپنی سونا ایسی دولہن نہ بچائے پادا او ترا ب سے اے پہاڑ الیسا پیڑ جرو رچھین لئے جیہے ــ ارے پیڑ دیوے کا ہے تو کوئی چمار کا تا کا جون ہاتھ پاؤں جوڑ کے بھلا کاٹ تو لے" یہ کہہ کر للّی نے اپنی چنری ڈھلکا دی۔ زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر سے راج دین، بھکّا، رام دین اور دلارے سب کے کلیجے چھید کر وہ جاتے جاتے مڑی۔

"میں بھیا کے لئے ٹوپی اور کلائی لاوت ہوں"

بڑی دیر تک سنّاٹا طاری رہا۔ مجّو بھیا سمیت سب منہ جھلائے بیٹھے رہے۔ عصر کی اذان سن کر بھیّا اُٹھے ان کے اُٹھتے ہی راج دین کے ساتھ سب اُٹھ پڑے۔

اور سلام کی رسم ادا کر کے نکل آئے۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی، لیکن حاجی بازار سے واپس نہیں آئے تھے۔ للّی نے چاول لگا کر لالٹین کی چمنی جوڑی اور جلا کر کوٹھری میں گھس گئی۔ بانس کے بنے ہوئے کپڑے رکھنے کے پٹارے کے ڈھکنے پر سے آئینہ اُٹھا کر اس نے اپنی چاندی کی سلائی سی مانگ پر ایک مطمئن نگاہ ڈالی اور کوٹھری بند کر دی۔ آگے آگے نوکر جھوّا لئے آیا اس کے پیچھے حاجی تھے۔ اُنھوں نے ڈلیا ترازو کونے میں دھرا اور لوٹے میں پانی لے کر وضو بنانے لگے۔

للّی نے رنگی ہوئی ٹوپی اور کلائی اُٹھائی تھی کہ اُسے یاد آگیا:

"بالامئو کی بزار ہے کل۔"

"ہاں ..... ہے ..... آدھی رات سے گاڑی ہانکی جیہیں۔"

"آدھی رات سے؟"

"اونہہ پچھلارے سے ہانکی جیہیں۔ لیکن اُٹھے کا تو آدھی رات سے پڑی ہے۔"

حاجی جھنجھلا گئے۔ "اور ای جو بادل لدے کھڑے ہیں۔"

حاجی نے اُٹھ کر سیاہ آسمان کو دیکھا اور ٹوپی پہن لی اور آدھے آنگن میں جا کر بولے:-

"کٹھل بھرے ہیں، کچھ مصری تھوڑے بھری گئی ہے۔"

"اچھا تو سُنو ..... میں تنی لپک کے بھیّا کا ٹوپی اور کلائی دے آؤں ... تم اتنے وخت گھرماں نماز پڑھ لیو۔"

للّی کا حکم سُن کر حاجی پلٹ آئے اور چٹائی ڈھونڈنے لگے۔

مجّو بھیّا مزدوروں کو رخصت کر کے اُٹھے ہی تھے کہ چھوٹے خاں آ گئے۔

"چچا مجھ کو آپ کا پیغام مل گیا تھا۔"

"ہاں مجّو خاں کو بھیجا تھا میں نے۔"

"اب آپ یہ بتایئے کہ محرم میں کتنا پیسہ صرف ہوتا ہے۔"

"بھائی پارسال تین سو چالیس لگے تھے۔"

"اس سال آپ چار سو پورے خرچ کیجئے۔" "لیکن محرم کیجئے دھوم سے۔"

"ہوں ..... تو صبح گھڑی بھر بیٹھ جاؤ ..... حساب بنا لیا جائے۔"

"آ جائیے گا۔"

مجّو بھیّا چھوٹے خاں کو رخصت کر کے گھر کے آنگن میں پہنچے تو للّی باورچی خانے کی طرف سے آ رہی تھی۔

"رجب کی اماں نا ئیں ہیں۔"

"نذر نیاز دلانے گئی ہوں گی۔" ..... "یہ کیا ہے۔"

للّی نے ہاتھ بڑھا کر مجّو بھیّا کے ہاتھ میں ٹوپی پکڑائی ہی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بڑے بڑے بوندوں کا ریلا ٹوٹ پڑا۔ مجّو بھیا دالان کی طرف لپکے مگر للّی نے جلدی جلدی آنگن میں جو کچھ پڑا تھا بین کر دالان میں کر دیا۔ اور باورچی خانے کے در میں لٹکی ہوئی لالٹین پر جھپٹی لیکن وہ اس کے پہونچنے سے پہلے ہی بھڑک کر رہ گئی بیٹھتے پانی میں پورا

آنگن پار کر کے وہ لالٹین دبائے ہوئی دالان میں آگئی جہاں اندھیرے میں مجّو بھیا کھڑے تھے۔

"دیا سلائی کہاں ہے بھیّا"

مکمل اندھیرے میں اس کی آواز کا شعلہ چمکا۔ اور مجّو بھیا چونک پڑے اور بڑی مشکل سے بولے۔

"کمرے میں تخت پر"

کڑکڑا کے بجلی چمکی تو اپنی ریشمی چنری نچوڑتی ہوئی للّی نے دیکھا کہ مجّو بھیا کے دیدے اس کے گریبان پر چپک گئے ہیں۔ اس نے ٹٹول کر چنری تخت کے کونے پر رکھ دی اور کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"یہاں تو بھیّا نہیں ہے"

مجّو بھیا اپنی شہتیر ایسی ٹانگوں پر پہاڑ سا بدن گھسیٹتے ہوئے اٹھے۔ کمرے کی دہلیز سے نکلتے ہی جلتے توے پر ان کا ہاتھ پڑ گیا اور دل اچک کر حلق میں اٹک گیا سنسان راتوں کے لمبے خوابوں کی جگمگاتی ہوئی زندہ تعبیر ان کے بازوؤں کی گرفت میں دھڑک رہی تھی۔ وہ اس لالچی بچّے کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ جسے مٹھائی کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ ابھی وہ اپنے ہاتھوں میں بھری ہوئی آرزوؤں کی دولت ایک نظر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ شانوں سے ان کے ہاتھ تراش لئے گئے۔ پھر انھوں نے بجلی کی روشنی میں دیکھا للّی آنگن میں چھپ چھپ کرتی بھیگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی

طرح تخت پر بیٹھ گئے۔ پانی بند ہوگیا۔ کسی نوکر نے لال ٹین جلائی۔ رجب کی اماں نے دالان صاف کر کے تخت پر دستر خوان بچھایا۔ کھانا لگایا۔ پھر اُٹھا لیا۔ نوکر نے بستر لگایا۔ مچھر دانی لگا کر کھڑا رہا پھر چلا گیا۔ باہر پہرے کا سپاہی مستعدی سے "جاگتے رہو جاگتے رہو" کے نعرے لگاتا رہا۔ لیکن مجو بھیا نے تخت چھوڑ کر نہ دیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے، کوس رہے تھے۔ للّی جو چبوترے پر کھڑی ہو کر اپنے شوہر کے بکھان کرتی ہے۔ جس کی شعلہ مزاجی کے سامنے بڑے بڑے فقرے بازوں کی زبانیں کوا اچک لے جاتا ہے وہ للّی جو فتنہ نہ کھڑا کر دے وہ تھوڑا ہے۔ بکس، فجو خاں استادمدّی کیا سوچیں گے رام دین اور لونڈے میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ میں مان پور کی مسجد کا امام جس کے سامنے جوان جوان عورتیں کرتے دوپٹے سے بے نیاز بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو دودھ پلایا کرتی ہیں۔ اور اپنے شوہروں کے قصّے بیان کرتی ہیں۔ میرا کیا ہوگا۔ عورتیں مجھ سے پردہ کرنے لگیں گی۔ مرد میرے نام پر تھوکیں گے.... اور لونڈے رنگے سیار پر تالیاں بجائیں گے۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھے۔ کیچڑ سے بھرے آنگن میں کامدار مخملی جوتا پہنے وہ ٹہلتے رہے۔ لیکن للّی جو کچھ کہے گی صبح کہے گی۔ پھر صبح اس سے معافی مانگی جا سکتی ہے منایا جا سکتا ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ پھر خیال آیا کہ آج تو حاجی میٹھے بالا مئو کی بازار کٹھل لے کر جائیں گے۔ ترپال مانگنے آئے تھے شام کو..... وہ کچھ مطمئن ہو کر سوچتے رہے اور رات گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

للّی جب گھر پہونچی تو چولہا بجھ چکا تھا۔ وہ حاجی سے بولے بغیر ان کے ساتھ کرنے

کے لئے روٹیاں پکاتی رہی۔ پھر موٹی موٹی روٹیاں گھی لگا کر ڈبے میں بند کر دیں۔ مٹی کے پیالے میں سوکھی سوکھی ترکاری رکھ کر اس نے حاجی کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے پلنگ پر گر پڑی۔ حاجی اور ان کے ساجھے دار دوسرے چھپر میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے اور دوسرے دن کے بازار پر قیاس آرائی بھی ہو رہی تھی۔

حاجی نے جب اُس کو جھنجھوڑ کر جگایا تو اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی جو اس کے بالوں کی طرح کالا تھا۔ اس نے جماہی لی اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"آسمان کا حال دیکھ رہے ہو حاجی"

"ہاں..... کل سودا ہو چکا ہے..... سنگی سب تیار ہیں..... چھتری ترپال سب کا انتظام ہے۔ اور دیکھو کوئی گھڑی بھر رات ہے اب۔ ہم ادھر سے رے زینب بہن کا پکار دینا ہوئی آئے کے لیٹ رہیں"

"تو دروازہ نہ بند کریں"

"نائیں..... دروازہ ضرور بند کرو..... مگر تنی چیتت سولو"

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر آکر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ حاجی نے بقرعیدی کے گھر پہ ہانک لگائی۔ تین چار آوازوں کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ حاجی نے تہرا کر اس سے زینب کو گھر بھیجنے کی تاکید کی۔ اور ہر بار اس نے بنیری بھر کا سر ہلا کر حامی بھر لی۔ لیکن دروازہ بند کرتے ہی اپنے پلنگ پر لڑھک گیا للی کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن نیند نہ آئی۔ کبھی تراب کی موذی مسکراہٹ اس

کی چٹیا پر چوتا مسل کر چلی جاتی اور کبھی مجّو بھیّا کی باہوں کے شیریں لمس سے خیالوں میں چاندنی چھٹک جاتی۔ ابھی وہ پوری طرح مسرور بھی نہ ہو پاتی کہ مجو بھیا کی شرماتی ہوئی آنکھیں اس سے کہتیں کہ جی پکس کی طرح میں نے تجھے چھیڑنے کے لیے یہ حرکت کی تھی۔ ورنہ تو یقین جان کہ میں تجھ کو جی ہی سمجھتا ہوں۔ خیال کے اس سنپولے کے دل پر رینگتے ہی وہ زور سے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیتی۔

دروازے پر تھپکی ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کنڈی کھول کر دروازہ جو کھولا تو دست پنے کی سی موٹی موٹی انگلیاں اس کی گردن پر جم گئیں۔ تراب نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کر دیا داہنے ہاتھ سے لّلی کی گردن دبوچے ہوئے منگلو کے گھر والے دروازے کی زنجیر کھول کر داخل ہو گیا۔

وہ چیں چیں کرتی رہی۔ تراب نے مسکرا مسکرا کر پانی بھرنے والی رسّی میں اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور اس کے منہ میں انگوچھا ٹھونس کر ایک لات مار کر پلنگ پر گرا دیا۔ اور کوٹھری بند کر لی۔ لّلی دل ہی دل میں صبح ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن جب تراب نے اُسے گود میں بھر کر پھر اس کے پلنگ پر لا کر ٹیکا اور آپ اس کے دروازے کی زنجیر کھول کر باہر نکل گیا۔ اس وقت بھی اندھیرا تھا تھوڑی دیر کے بعد فجر کی اذان ہوئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کسی نے دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر وہ اٹھی، دروازہ کھولا تو مجّو بھیا کھڑے تھے۔ جس ہاتھ سے وہ کواڑ

پکڑے تھی اس کی کلائی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زخمی تھی ۔ پھر مجو بھیا نے اس کی کرتی دیکھی جس میں لہریں جھول رہی تھیں ۔

" یہ کیا ہوا ۔ ؟ ۔ "

" یہ کیا ہوا آخر ؟ ؟ "

مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا ۔ اور للّی کی کلائی تھام لی ۔ للّی ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرح ان کے دیوار ایسے سینے پر ٹک کر رونے لگی ۔

راج دین نے مجو بھیا کے یہاں سے آتے ہی چار چار کوس تک سارے گاؤں کو خبر بھیجدی تھی کہ دوسرے دن بازار کے وقت پہونچ جائیں ۔ دس ہی بجے سے آدمی گرنا شروع ہو گئے تھے ۔ کوئی بارہ بجے تک راج پورہ کے ایک ایک گھر میں کیڑے مکوڑوں کی طرح آدمی بجکنے لگا ۔ اس کے بعد راجپورہ کے سامنے والے باغ میں آدمیوں کا کھلیان لگ گیا ۔ ابھی دو ہی بجا تھا کہ رام دین اور ولارے کلہاڑیاں لے کر کھن والے پیڑ پر پہونچ گئے ۔ اس کی پیڑی پر کلہاڑی مار کر جنگ کا ڈھول بجا دیا ۔ بھیکم پور کے چاروں نے جو سودا سلف لینے مان پور جا رہے تھے یہ رنگ دیکھا تو اُلٹے پیروں جا کر پیرا کے گھرانے کو خبر کر دی ۔ پیرا اپنا ناریل لے کر چھپر سے نکلا تو آدمی سمٹنے لگے ۔ کوئی چالیس پچاس آدمیوں کو عقب میں لئے پیرا نے دیکھا کہ دو لونڈے کلہاڑی لئے کھلواڑ کر رہے ہیں تو وہ مسکرا دیا لیکن پیرا کی بوڑھی آنکھیں منظم سازش کی تہہ تک پہنچ گئیں ۔ اس نے ناریل پاس کے آدمی

کو پکڑا دیا۔ اور نرمی سے بولا:۔

"بھلا بھولا پیڑ کیوں کاٹے ڈالت ہو بھئی؟"

"روک پاؤ تو روک لو"

پیڑ اس جملے کی دھار پرکھ رہا تھا۔

کہ راجپورہ کے باغ سے پاسیوں کی آندھی چلتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی اُن لوگوں کی طرف سے آدمیوں کے غول آتے نظر پڑے تو اس کی ڈھارس بندھی۔ ساتھ ہی بھیکم پور سے بھی آدمی سمٹنے لگے تھے۔ چھوٹے خاں نے آتے ہی پاسیوں کو ڈانٹا کہ روز تم لوگ کوئی نہ کوئی بسنت بنایا کرتے ہو۔ پیڑ کس کا ہے۔ آواز آئی مجو بھیا کا ہے۔ مجو بھیا کا نام سُن کر چھوٹے خاں کچھ دھیمے پڑے۔ پھر گدیوں کی طرف سے نعرہ بلند ہوا کہ جس کا کھیت ہے اس کا درخت ہے۔ اس قانونی بات چیت میں جتنا وقت لگا اتنے وقت میں لکھن والے جامن کے پورب اور پچھم میں دور دور تک آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ پورب میں پاسی پچھم میں گدّی۔ مان پور والے کبھی اِدھر کی حامی بھرتے کبھی اُدھر کی، سنجیدہ کوئی نہ تھا۔ سب تماشہ بینی کرنے نکل پڑے تھے۔ ویسے ہاتھ کسی کا خالی نہیں تھا۔ بانے، ٹِپے، تلوار، بلّم، کانتے لاٹھی ہر چیز دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے محرم میں کرتب دکھانے آگئے ہوں۔ مان پور کے مکھیا چھوٹے خاں نے آدمی بھیجکر مجّو بھیا کو خبر کرا دی تھی۔ مجو بھیا نے اپنے سارے نوکروں کو پہلے ہی رام دین کی حمایت میں روانہ کر دیا تھا۔

خود نیا ڈوری دار جوتا پہنے صحن میں چر مر کر رہے تھے ۔ مگر بھیگی ہوئی زمین پر جوتے کی مدھم آواز کی وجہ سے اُنھیں ٹہلنے میں مزا نہیں آ رہا تھا۔ مبارک ڈھپالی نے آکر خبر دی کہ ہندو مسلمان میں گڑبڑ مچا ہے ۔ چھوٹے خاں بلاوت ہیں۔ مجو بھیا نے کوئی موٹی سی گالی دے کر اسے دھتکار دیا اور بولے کہ اگر ہندو مسلمان کا نام لیا تو اتنے جوتے ماروں گا کہ بھیجہ باہر نکل جائے گا۔ مبارک نے مجو بھیا کو بگڑتے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ کان دبا کر بھاگ لیا ۔ مجو بھیا نے بڑے اطمینان سے اصطبل کھولا ۔ سفید گھوڑے کو جسے وہ بجلی کہتے تھے ، باہر نکالا ۔ اپنے ہاتھ سے کاٹھی رکھی اور اوٹے پر کھڑے ہو کر سوار ہو گئے ۔ اُسے "یرغہ" چلاتے ہوئے موقعہ پر پہنچے پاسیوں کی کثرت دیکھ کر محظوظ ہوئے ۔ رام دین نے کلہاڑی رکھ کر الف ہوتے ہوئے گھوڑے کی لگام تھام لی ۔ رام دین جس نے مجو بھیا کے ساتھ ڈنڈیں لگائی تھیں ۔ مگدر ہلائے تھے ۔ کھلیان اُٹھائے تھے اور گھوڑے خریدے تھے ۔ مجو بھیا تن کر کاٹھی پر بیٹھے اور کڑک کر بولے :-

"چھوٹے چچا ۔"

"ہاں بھیا ۔"

اُنھوں نے بٹوے سے لونگ لے کر ڈوری گھسیٹ لی ۔

" آپ فجو خاں ، بکس اور استاد مدّی کو لے کر ان پور چلے جائیے محرم ہے یہ ..... سیدھے چلے جائیے ۔"

محرم کا نام آتے ہی چھوٹے خاں چونک پڑے۔ بٹوہ اپنے کرتے کی جیب
میں گھسیٹر کر لونڈوں کو ڈانٹا جو اڑیل بیلوں کی طرح ایک قدم چل کر ٹھٹھک گئے
جب مان پور کا بچہ بچہ چیری کے کھیت تک پہونچ گیا تب مجو بھیا نے اپنا گھوڑا گدیوں
کی طرف موڑا جن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں تھیں۔

"پیرا:" مجو بھیا رکابوں پر کھڑے تھے۔

"کہیو"

"تمرے بھویں اور بیٹی دونوں ہیں شاید؟"

"ہیں۔"

ابھی ان کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بھیڑ کو چیر کر تراب باہر نکلا اور لاٹھی اوبار
کر دوڑا۔ مجو بھیا، بھگا اور راج دین کے ہونٹوں پر ایک قسم کی زہریلی مسکراہٹ
رینگ گئی۔ مجو بھیا نے اپنے ڈوری دار جوتے کی ایڑی بجلی کے پیٹ میں گاڑ دی
اور رُخ بدل کر مان پور والوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ لاٹ ایسے تراب کی
گولے دار لاٹھی اور مجو بھیا کے گھوڑے کا فاصلہ دانت پیستے ہوئے پاسیوں کے
کُھرپا ایسے ہاتھوں میں ناچتی گولے دار لاٹھیوں سے بھر گیا۔ دلارے نے اپنی دھوتی
سے دیسی پستول نکال لیا۔ اس کی کھُردری بے ہنگم نال میں مٹیالے رنگ کا کارتوس
لگا کر تا نا ہی تھا کہ بھگا اور راج دین کی سنگت میں کوئی دو درجن لاٹھیوں نے تراب
کو اپنی باڑھ پر رکھ لیا۔ تراب کی مدد کو گدیسی دوڑے لیکن ہزار بارہ سو پاسیوں کے
سیلابی ریلے میں بہہ گئے۔ بہت سے گدی بھی مان پور والوں کی طرح ہاتھوں میں

سودا سلف لئے بغل میں لاٹھی دبائے نکل آئے تھے۔ بہت ایسے بھی تھے جو
زندگی کی یکسانیت سے اُکتا کر محض تفنن طبع کے طور پر آنکلے تھے۔ لیکن اتنی بات
سچ تھی کہ چند کو چھوڑ کر سارے کے سارے گدّی ان پاسیوں کے سامنے مطمئن تھے
جن سے ابھی چند روز قبل وہ بھینسیں چھین کر ہانک لے گئے تھے۔ مجّو بھیا کے فقروں
اور تیوریوں پر وہ چونکے ضرور تھے۔ لیکن مان پور کی آدھی جوان آبادی کو کھڑا دیکھ کر
ان کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔ آتش بازی کی چرخی کی طرح جب پاسیوں کی لاٹھیاں
چوکھی مار کرنے لگیں اور مان پور والے بھیڑ لگائے کھڑے رہے، جیسے محرم کے اکھاڑے
میں تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ تو کسی چالاک گدی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بھاگتے ہوؤں کو
جیسے کمک مل گئی۔ انھوں نے گلے پھاڑ کر "اللہ اکبر" کی تکرار کی۔ راج دین اور بوڑھے
بوڑھے پاسیوں کے ہاتھ سُست ہو گئے اور انھوں نے بڑی حسرت سے مجّو بھیا کو دیکھا
مان پور والوں میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے تراب کے ساتھ بانے ہلائے تھے۔
تاڑی کے کچھڑ توڑے تھے، عورتوں کے بدن لوٹے تھے اور مار کھاتے ہوئے تراب کو دیکھ
کر تازی کتّوں کی طرح زنجیر تڑانے کی فکر میں تھے۔ دلوں میں آگ بھر دینے والی اس
آواز کو سُنتے ہی بے قرار ہو گئے "اللہ اکبر" کی تکرار کرتے ہوئے لاٹھیاں سونت لیں اور
دوڑ پڑے۔ لیکن مجّو بھیا نے زین میں لگے ہوئے چابک کو سَٹ سے گھسیٹ کر بجلی کے
ایڑ لگائی جو پھنپھناتا ہوا نوخاں، اور بکس کی چھیا کا راستہ روک کر پاؤں پٹخنے لگا۔
پھر نوخاں اور بکس کے کئی جیالے ساتھیوں نے اپنے بازو اور سینے پر کوڑے کی جلتی

ہوئی چوٹ محسوس کی۔ ساتھ ہی مجّو بھیا، چھوٹے خاں اور دوسرے بڑے بوڑھوں کی گالیوں کی بوچھار تیروں کی طرح ان کے کلیجوں پر پڑی اور وہ جہاں تھے وہیں مچل کر رہ گئے۔ اب میدان صاف ہو چکا تھا۔ ہیرا، تراب، اور تراب کے بھتیجے کی لاش چھوڑ کر سارے گدّی بھاگ نکلے۔ بھکّا اور راج دین نے لاٹھی کے گولوں سے تراب کی لاش بگاڑ دی پھر آدمیوں کو سمیٹ کر بھیکم پور پر ہلّا بول دیا۔ چیختی ہوئی عورتوں نے اپنے آپ کو اور روتے ہوئے بچّوں کو اُٹھا کر کوٹھریوں میں دفن کر لیا۔ یا پڑوس کے پُردے پر بھاگ نکلیں۔ تراب کے اندر سے بند دروازے پر چھوٹے سے چھپر کا مٹھا پھر پوس نوچ کر بھکّا نے البٹّی سے دیا سلائی نکالی ہی تھی کہ حدِّ نگاہ تک پھیلے ہوئے پاسیوں کی کائی پھاڑ کر مجّو بھیا کا بجلی تراب کے چھپر کے پاس پہونچ گیا۔

"راج دین"

"بھیا"

"یہ کچھ نہیں ہوگا۔ تم گاؤں کی کسی مرغی تک کو بھی نہیں چھیڑوگے۔ بس پچاس آدمی روک کر تراب کے گھر کا پہرہ دو۔ سونا باہر نکل گئی تو مقدمہ ہار جاؤگے۔ میں تھانے خبر بھیجتا ہوں"

پھر سارے میں لال صافے پھیل گئے۔ مان پور تک میں طاعون سا چل گیا۔ چھوٹے سے بڑے تک سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ مجّو بھیا کے نوکر اور مجّو بھیا کے گھوڑے سڑکوں پر دوڑتے نظر آتے اور بس عشاء کی اذان ہوتے ہوتے

ہردوئی کا سپرنٹنڈنٹ پولیس آگیا۔ مان پور کے مڈل اسکول میں تھانیداروں سے
گفتگو کرنے کے بعد علاقے کی سب سے بڑی بستی کے سب سے بڑے آدمی کو طلب
کیا۔ جامدانی کی شیروانی اور چوڑی دار پائجامے پر لکھنؤ کا کڑھا ہوا، پلا دیئے۔ سچّے
کام کے جوتے کو آہستہ آہستہ چرمراتے ہوئے دیو قامت مجّو بھیا ہال میں داخل ہوئے تو
انگریز سپرنٹنڈنٹ نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملایا اور کرسی کی طرف اشارہ کرکے بیٹھنے کو کہا۔
گیس کی تیز روشنی میں ان کے دہکتے چہرے پر بڈھے انگریز کی نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ کپتان
اور کپتان کی موجودگی میں ہندو تھانیدار نے ایک سے ایک ترچھے ٹیڑھے سوال کئے۔
لیکن مجّو بھیا نے اس بلوے کو ہندو مسلم فساد نہ بننے دیا۔ گدیوں نے یہ تو دیکھا ہی
تھا کہ اگر مجّو بھیا بیچ میں نہ آجاتے تو پاسی پورا بھیکم پور پھونک دیتے۔ نہ کہ تراب کا
چھپر تک کھڑا تھا، پھر ان کو یقین تھا کہ اگر مجّو بھیا کا نام درمیان میں آگیا تو مان پور سے
مسلمان شہادت کا ملنا آسان نہ ہوگا۔ اس لئے گدیوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجّو بھیا کا
نام نکالا تھا۔ پاسیوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجو بھیا کو اس کا علم تھا۔ وہ
ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے جواب دے رہے تھے۔ انگریز کپتان اور ہندو تھانیدار دونوں
ان کی سچائی کے معترف تھے۔ مرعوب تھے۔ مجو بھیا کے گھر سے آئی ہوئی چائے کی
ایک پیالی پی کر جب کپتان جیپ پر بیٹھا تو اس نے مجّو بھیا سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔
وہ اپنے بجلی پر سوار ہوکر کپتان کی جیپ کے آگے آگے چلے۔ اور ان کی موجودگی میں
تراب کے گھر سے بھگا پاسی کی بیوی سونا برآمد ہوئی۔ جس کے وجود اور بیان نے

نہ صرف مقدمہ کی نوعیت بدل دی بلکہ مجّو بھیّا کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ ابھی
کپتان سونا کا بیان دیکھ رہا تھا کہ پٹواری لال پرشاد جھوّابھر کاغذات لے کر مجّو بھیا
کے پاس آگئے اور مجّو بھیا نے کھن والے پیڑ کے اندراجات کپتان پولیس کو دکھلا
دیئے۔ جن کو وہ اتنے غور سے دیکھ رہا تھا گویا واقعی سب کچھ سمجھ رہا ہو۔
مان پور کے مڈل اسکول میں ساری رات گیسیں جلتی رہیں۔ رتجگہ ہوتا رہا۔
صبح ہوتے ہوتے لاشیں اور سات پاسیوں کا چالان روانہ ہو گیا۔ مجّو بھیا جب گھر
آئے تو بھیڑ بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اپنی اہمیت کا اندازہ کر کے مسرور ہوتے رہے۔
انھوں نے مختصر جوابات عنایت کئے۔ چھوٹے خاں کی قیادت میں مجمع منتشر ہو گیا
وہ شیروانی اتارتے ہوئے اندر گئے تو باورچی خانے میں رجب کی اماں کے ساتھ للّی
بھی چائے کے برتن درست کرنے لگی۔ للّی کے گورے گورے ہاتھوں میں چائے کی
کشتی دیکھ کر ان کی تھکن پر لگا کر اڑ گئی۔ جیسے دن بھر کے تھکے بیل گڑ کی لُوئی کھا کر تازہ دم
ہو جاتے ہیں۔ للّی نے انڈوں کے چلّے کی پلیٹ اور تر تراتی ہوئی روغنی روٹیاں ان
کے آگے رکھیں تو ان کے ہونٹوں کو للّی کے گالوں کی لذّت یاد آگئی۔ ان کی گردن نے
شانوں سے نکل کر گھر کا جائزہ لیا۔ سارے میں سنّاٹا تھا۔ باورچی خانے سے رجب
کی اماں کی کھٹر پٹر کی آواز آرہی تھی۔ مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی میدے کی کلائی پکڑ لی۔

"تراب کی لاش دیکھ لی تم نے"

"ہاں"

اس نے اپنی کلائی چھڑا کر کہا۔

٭ ٭ ٭

للّی نے اپنے دروازے سے دیکھا۔ حاجی میٹھے کھیت میں پانی لگا رہے تھے۔ نوکر ڈول کھینچ رہے تھے۔ مرغیاں ٹاپے کے اندر کڑکڑا رہی تھیں۔

"حاجی کھول دیتے تو ہاتھ نا ئیں ٹوٹ جاتے"۔

بڑبڑا کر اس نے جھینکے سے روٹی کی ڈلیا اتاری۔ ایک ہاتھ سے ٹاپے کی سل اُلٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اطمینان سے روٹی کل مل کر ان کو کھلاتی رہی۔ کنکھیوں سے ٹاپے کے پاس پڑے ہوئے انڈے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد منگلو کی موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ "گھمکے" سنائی دیئے۔ اس نے ڈلیا پھینک کر کنواری لڑکیوں کی طرح قلانچ لگائی اور دروازے کی جھریوں پر آنکھیں رکھ دیں۔ مرغیاں کُڑکڑاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے آکر کھڑی ہو گئیں، لیکن وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی دروازے پر جھکی رہی۔ چندا کا دوپٹہ زمین پر پڑا تھا۔ اُلجھے بالوں کی لٹیں مُنہ پر جھول رہی تھیں۔ آنکھوں سے بہہ کر موٹے موٹے آنسو لال لال گالوں پر چمک رہے تھے۔

"تم ہوں اُو کے بدمعاس کے ساتھ کسے میں ہنڈ ہوئے کے چلی جاؤ"

منگلو نے کٹکٹا کر کہا اور دھم دھم گھونسے مارنے لگا۔ للّی نے جھن سے زنجیر کھولی اور گڑاپ سے اندر چلی گئی۔

"تو کا مار ڈلیو تم ای کا...... چھوڑو"

منگلو کے ہاتھ سے چندہ کی کلائی چھڑا کر وہ اُسے لئے ہوئے اپنے گھر چلی آئی۔ پیتل کے لوٹے میں پانی بھر کر چندہ کا منہ ہاتھ دھلایا۔ پھر مراد آبادی گلاس میں گڑ کا شربت بنا کر اُسے پلایا۔ للّی نے اپنے دل کی جھولی میں خوشیوں کی اشرفیوں کی ایسی جھنجھناہٹ سُنی کہ انگ انگ ناچ اُٹھا۔ "موت زندگی اللہ کے گھر سے ملتی ہے..... رو دھو کر اپنا آپ جلاتی ہو..... مٹی خراب کرتی ہو۔"

للّی نے چھوٹے خاں کی بہو کی پیاری پیاری باتوں کی نقل کی۔ پھر چندہ کے سوکھے بالوں کی چوٹی گوندھنے لگی۔

"آج بھیا پوچھ رہے تھے کہ تراب کی منگلو کی دلہن سے بھی کچھ جان پہچان ہے۔"

چندہ نے چونک کر اپنے بال چھڑا لئے۔ لال لال آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"مجو بھیا پوچھت رہن؟"

"ہاں..... معلوم ناہیں ان کا کیسے سن گن مل گئی۔"

"تم کا کہیو؟"

"میں کہیوں..... اللہ اللہ کرو بھیا..... دیوار سے دیوار ملی ہے مورے گھر کی..... دال تک بگھاری گئی تو میں کا معلوم..... اتنا لاٹ ایسا آدمی آتا تو پردے پڑے رہتے۔"

"پھر؟"

"پھر کا — چپ سادھ لی..... مگر ہے ان کا شک۔"

محرم بھر حکام پڑے رہے۔ ان کے ناشتے کے انڈوں سے لے کر گھوڑوں
کی گھاس تک مجّو بھیا کے نوکر مہیا کرتے رہے۔ تھانیدار سکینہ تو ان کا مرید ہو گیا
تھوڑی سی دوڑ دھوپ کر کے اس نے مجّو بھیا کو بندوق کا لائسنس دلا دیا۔ اِدھر
مجّو بھیا نے مقدمے کی ایسی پیروی کی کہ ایک ایک آدمی سیشن سے چھوٹ گیا۔
ٹھیک ہولی کے دن مجّو بھیا لکھنؤ سے دونالی بندوق خرید کر لائے۔ رات میں پاسیوں
نے مجّو بھیا کے دوارے پر جشن کیا۔ رات بھر کرتا اھیاں پڑھی رہیں۔ رات بھر
رنڈیاں ناچتی رہیں۔ للّی نے اسی رات مسجد میں طاق بھرے اور میلاد شریف کیا۔
مجّو بھیا شامیانے کے نیچے گاؤ لگائے الوان اوڑھے سگریٹ پیتے رہے۔ ناچ
دیکھتے رہے۔ وہ شرمیلے مجّو بھیا جو جوان عورتوں کا راستہ چھوڑ دیتے۔ بات کرتے تو
لڑکیوں کی طرح آنکھیں نہ اُٹھاتے۔ ہزار بارہ سو پاسیوں کے دیو استھان پر بیٹھے
ہوئے خرانٹ عیاش کی طرح ناچ دیکھتے رہے۔ رام دین اپنے جکّی کے پاٹ ایسے
سینے پر کارتوسوں کی پیٹی کا تمغہ لگائے ان کے پیچھے بیٹھا رہا۔

مجّو بھیا کے مکان سے گزرتی ہوئی سڑک پر تھوڑی دور چل کر بائیں طرف مڈل اسکول
تھا، جس کی جھنجھری دار چہار دیواری گوٹ کی طرح سڑک پر رکھی تھی۔ اس کے سامنے
سڑک کے دوسری طرف اسکول کی فیلڈ تھی جسے لوگ میدان کہتے۔ یہاں بستی بھر کے
چھٹّا جانور چرا کرتے۔ لڑکے گلّی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے کبھی کبھی تینگ کے "میچ"
بھی منعقد ہو جاتے۔ اس کے اطراف میں پٹھانوں، کبڑیوں اور دوسروں کے ملے جُلے

مکان تھے۔ نئی لڑکی کی پکائی ہوئی روٹی کی طرح ٹیڑھی میڑھی دیواروں پر بوڑھی عورتوں کے بالوں کی طرح مُردہ سے چھپر جھولا کرتے۔ بوڑھی کھوسٹ دیواروں سے پھوٹتے سوراخوں سے سیراب ہوتے ہوئے کالے نابدان راہگیروں کی ناک پر رومال رکھ دیتے کبھی نہیں بلکہ اکثر یہ کالی غلاظت سودے سلف سے لدے پھندے بوڑھے بوڑھے آدمیوں کو اسکول کے لڑکوں کی قواعد کراتی رہتی۔ عورتیں اپنی دہلیز کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر بچّوں کے لئے منڈاس بنا دیتیں۔ جس چبوترے کے چھپر میں کالو درزی کی مشین رکھی تھی وہاں سے جلیبی جان کے گھر تک دونوں طرف دوکانیں ملتیں۔ جلیبی جان کے مکان کے سامنے سڑک کے داہنی طرف لمبے چوڑے میدان میں گوریا سے لے کر ہاتھی کی قبر کے سائز تک کے ان گنت چبوترے ملتے جن پر ہفتے میں دو دن دوکاندار اپنی دوکانیں سجاتے۔ اس کے آگے سکلیوں ڈھپالیوں کی بستی فقیر کی گدڑی کی طرح پڑی سوکھتی رہتی۔ جس پر بدصورت عورتوں اور غلیظ بچوں کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف مڑ کر دیکھنے سے مان پور کی مسجد کا گنبد نظر آتا۔ جس کا صحن مجو بھیا نے وسیع کرایا تھا۔ مسجد کے پاس ہی پرائمری اسکول کی جھکی جھکی سی عمارت دکھائی پڑتی۔ جیسے کوئی لڑکا ملگجے کپڑے پہنے ٹاٹ پر بیٹھے ہوئے نقشہ بنا رہا ہو۔ پرائمری اسکول کے سامنے آبادی ہے اور پیچھے کھیت۔ اس کے لمبے چوڑے رقبے کو بانسوں کا سرسبز احاطہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے کمروں میں مختلف لوگ مختلف قسم کے کام کرتے۔ دن میں لڑکے پڑھتے

ہیں۔ شام میں اگر کھیت کھلیان کا جھگڑا نہ ہوا تو "لکی لکورا" کھیلتے نوخیر لڑکے اور لڑکیاں اُن کے اندھیارے کنوں میں "نمبردار اور تربھون" کی نوٹنکی میں دیکھی ہوئی لیلیٰ مجنوں کی کہانی دہراتے۔ اغوا کی ہوئی عورتیں اس کے کمروں سے برآمد ہوئیں۔ جب جمنی لال چپراسیئے اور چھبو مل کلوار نعل نکالنے میں بے ایمانی کرنے لگتے تو مجبوراً یہاں بھی دو چار دن جوا کھیل لیا جاتا۔ یہاں سے تیر کی طرح سیدھا گلیارہ چھ سات گھروں کو پار کرکے چھوٹے خاں کے گھر کے پاس ٹھٹھک جاتا۔ چھوٹے خاں کے چبوترے سے ملے لمبے چھپر میں ان پورہ کا مکتب تھا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو نابینا مولوی صاحب قرآن مجید پڑھانے کے بہانے دن بھر بیٹھے اونگھا کرتے اور محلے سے آئی ہوئی روکھی سوکھی روٹی کھاکر جانوروں کی طرح ڈکارتے رہتے اور اس خدا کا شکر ادا کرتے جس نے ان کو مولوی صاحب بنا دیا۔ چھپر کے سامنے پختہ کنواں تھا۔ جس کی جگت سے ملا ہوا حوض دُھلی ہوئی پنڈلیوں اور کلائیوں سے جگمگایا کرتا۔ یہ کنواں محلے کے بنجر علاقے میں سرسبز نخلستان کی طرح قہقہوں سے کھنکتا رہتا۔ سرگوشیوں سے گنگنایا کرتا بقاتی کی لڑکی گھڑے سے چلو میں پانی لے کر منہ دھو رہی تھی کہ نجو خاں نے اپنے بروٹھے کی آڑ سے کنکری ماری اس نے بھیگی ہوئی آنکھیں سکیڑ کر پہلے نجو خاں کی جھانکتی ہوئی دھوتی دیکھی پھر ادرگرد کا مطالعہ کرکے اطمینان سے منہ دھونے لگی۔ نجو خاں اس بروٹھے میں کھڑے رہے، جس کے ایک کونے میں بکری کے کھونٹے کے پاس مینگنیاں پڑی سلگ رہی تھیں۔ جیسے عود دان میں عود مہکتا ہو۔ پھر نجو خاں آہستہ سے دروازہ

کھول کر باورچی خانے میں بوڑھی اماں کو بھڑے کا آٹا گوندھتے ہوئے دیکھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ بانس کی ڈھکن دار ڈلیا میں کتھے چونے میں لت پت مٹی کی کلھیاں رکھی تھیں۔ اُنھوں نے ان کو نکال کر نیچے کا پرت دیکھا لیکن ایک بھی پیسہ نہ پاکر پلنگ کے نیچے سے ٹین کا صندوق گھسیٹ لیا۔ ڈھکنا ان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ پیچھے سے ان کی دولہن کلثوم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اللہ قسم ایک پیسہ نہیں ہے ان میں۔"

مجو خاں نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تو دیکھ لینے دو — پریشانی کا ہے کی ہے۔"

بکس میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ لپٹ گئی۔ مجو خاں نے اُسے کمر سے اُٹھا کر اتنے زور سے چارپائی پر دے مارا کہ وہ چیخ پڑی۔ چیخ کی آواز سُن کر چھوٹے خاں نے ہانک لگائی:

"مجو ...... ابے اے مجوا۔"

مجو نے باپ کی آواز جو سُنی تو کلثوم کے کالے کالے گالوں کو ہاتھ میں لے کر مکار آنکھوں سے خوشامد کرنے لگے۔

"سُنا نہیں تو نے۔"

جلدی سے باہر نکل کر چوروں کی طرح وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اسکول چھوڑا — کھیت کھلیان چھوڑا — اب بھیا کے یہاں اُٹھنا بیٹھنا بھی چھوڑا۔ گھر میں کوئی خزانہ گڑا ہے کہ میں کھود کھود کر دوزخ بھرتا رہوں۔ دس مرتبہ کہا کہ بھیا سے کہہ کر

ہزار کا ٹھیکہ لے لے۔"

"نیلام کے دن تو آویں..... کہ ٹھیکہ کوئی کھٹیا ہے..... جب جی چاہے لے آویں۔"

"سُنتی ہو تم مجو کی اماں...... باتیں دیکھو سالا کیسا بارہ ہزار کی کرتا ہے۔"

چھوٹے خاں تقریر رٹ چکے تھے۔ ابھی اُنھوں نے ابتدا ہی کی تھی مگر مجو خاں بروٹھے میں غڑاپ سے اوپ ہوگیا۔ کنویں کی جگت خالی پاکر وہ آگے بڑھ گیا۔ بشیر اپنے بھائی کی پرچون کی دوکان پر بیٹھ کر پُڑیاں باندھتے شعر کہتے اور کوئی خوش رو گاہک آجاتا تو گنگناکر آنکھیں سینک لیتے۔ جلیبی جان کے چبوترے کے ایک مُونڈھے پر بشیر کا بھی نام لکھا تھا۔ مجو خاں نے پہلے سوچا کہ بشیر سے کہے پھر خیال آیا کہ یہ خود ہی ایک آدھ بیڑی کے بنڈل پر دن بھر پُڑیاں لپیٹا کرتا ہے۔ اس کے پاس کیا ہوگا۔ نور علی اپنے بساطے کی چادر پر بیٹھے طلسم ہوشربا کے انداز میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ سامعین انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے سُن رہے تھے۔ جیسے تراویح سُنی جارہی ہو۔ دوکان کے پیچھے تین ٹانگ کے تخت پر میلے کچیلے اُٹنگے پائجامے اور تہبند پہنے برسوں کے پرانے تاش کھیل رہے تھے۔

وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ منور نے پتا پھینک کر صدا دی۔

"اینٹ کی بیگم حکم کے یکےّ پر چلی گئی خاں صاحب۔"

مجو خاں نے مسکرا کر اس کا جواب دیا اور کھیسیں نکالے ہوئے چمرودھے جوتے کو گھسیٹتا بڑھ گیا۔ چنی لال جرسیئے کے چھپر میں بیٹھا منگلو کوڑیاں ہلا رہا تھا۔ اس نے مجو خاں کو دیکھ کر سلام کیا اور کوڑیاں پھینک دیں۔ مگر مجو خاں اُڑے چلے گئے۔ منگلو قصائی کے

دروازے پر بھرجی کا کالا کالا لڑکا پیتل کی تھالی میں چنے کی دال کی پٹی لئے کھڑا تھا۔ چندہ کرتے کا دامن اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبائے شلوار کے ازار بند میں بندھے ہوئے پیسوں کی گرہ کھول رہی تھی۔ مجو خاں کی نظر اس کے پیٹ پر جم گئی۔ پھر کولھوں کا طواف کرتی ہوئی للّی کے آنگن میں داخل ہو گئی۔

"کا چلے آویں — چچی"

"آؤ — آؤ"

للّی نے روٹی کو توے پر ڈال کر اپنے گھٹنے لہنگے میں چھپا لئے۔ گھائیں کی روٹی گھماتے ہوئے بولی:۔

"کیسے آئے گو اتنے وخت"

للّی کے لہجے کی ٹھنڈک سے وہ کھٹک گیا۔ لیکن ہونٹوں پر آئی ہوئی اُگل ہی دی۔

"آج ایک اٹھنی دے دیو..... کل بارہ آنے لے لیو"

"کا نٹھی پیڑے مانگن ہیں"

"یہی سمجھ لیو"

پیسے تو بھائی اتنے وقت ناہیں۔ کہو تو ترکیب ایک بتائے دیں"

"بتاؤ" وہ بہت دور سے بولا

"چندا کل ایک گنّی بھنائن ہیں"

"گنّی..... اور چندہ"

"ارے ہاں...... تراب کی دی ہوئی ایک آدھ پڑی ہوئی ہے"

"ہوں۔ اب ہی منگو چنی لال چرسیئے کے یہاں بیٹھے تھے۔ میں کہوں مینڈکی کو زکام کہاں سے ہوا"

"اینٹھ لیو دو ایک روپیہ تم ہو"

"ہے اتنے وقت اکیلی"

"اتنے وقت روٹی پانی کے وقت کون سُگا بیٹھا ہوا ہے..... منگلو ہوئے تو ہوئے"

"منگلو تو کوڑی پھینک رہے ہیں...... اِدھر سے چلے جائیں"

"چلے جاؤ"

فجو خاں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ چھپّر میں چارپائی پر بیٹھی چندہ بیٹی کھا رہی تھی۔ چونک کر کھڑی ہوگئی۔ سرہانے سے چادر اُٹھا کر اوڑھنے لگی۔

"مجو بھیا نے بھیجا ہے تم سے بات کرنے کو...... دروازہ بند ہے باہری"

فجو خاں نے کھنکار کر کہا اور اس کے بھاری بدن کے نشیب و فراز کو گھورنے لگا وہ چپ کھڑی رہی تو فجو خاں نے خود جا کر اپنا اطمینان کر لیا۔ اور اس کے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور بڑے متفکرانہ انداز میں بولے:۔

"تراب نے ایک گدّی سے کہا تھا کہ پستول تمہارے پاس ہے..... اب وہ گدّی بھیا کے پاس آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر چندہ نے پستول نہ دیا تو پولیس کو خبر کر

دی جائے گی۔ پولیس خود برآمد کرالے گی۔

"چاہے جیسی قسم لے لیو..... میں نائیں جانت ہوں پستول"

"دیکھو پولیس کو پہلے ہی سے سُن گُن ہے۔ بھیّا نے پائوں نہ ٹیکا کیونکہ تم اگر پولیس کے ہاتھ پڑ جاتیں تو معلوم نہیں کیا حشر ہو گیا ہوتا تمہارا اس لئے"

"تراب نے گنّی بھی چھوڑیں"

"گنّی"

"ہاں ہاں گنّی..... جو کل بھن کرائی ہیں ہردوئی سے تب ہی کہہ رہا ہوں آج"

اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ فجو خاں نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ لیا اور گریبان کے گریباں میں ہاتھ ڈال دیا۔

جلیبی جان کی صورت تو ایسی تھی جیسے بھینس کی ران پر چاقو سے آنکھیں گود دی جائیں۔ ناک کی لکیر کھینچ کر دو نقطے رکھ دیئے جائیں۔ مگر خدا نے گلا ایسا نور کا دیا تھا کہ بڑی بڑی اکھاڑے دار طوائفیں بے سری ہو جاتیں۔

مان پور کے جوانوں کو پنڈت درگا سہائے کی شادی یاد تھی۔ گکراواں کی کوٹھی کے سامنے شامیانے میں لکھنؤ اور فیض آباد کی طوائفوں کے ڈھیر لگے تھے جب جلیبی جان اپنے سازندوں کے ساتھ پہونچیں تو محفل تو خیر محفل تھی۔ طوائفیں تک منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بدصورت ہیجڑے نے پیشواز پہن لی ہو۔ طبلے پر رام دُلارے کی تھاپ پڑتے ہی جلیبی جان نے ایک ہاتھ کان پر رکھ

کر جو تان لگائی تو محفل سانس لینے لگی۔ ساز ٹوٹنے لگے۔ جلیبی جان نے میٹھے میٹھے بدنصیب انشا کی وہ غزل چھیڑی جس میں اس کے نصیب کی کافر ماجرائی دھڑک اٹھی ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تو بوڑھے بوڑھے رئیس جن کے سینوں میں فارسی کے دیوان دفن تھے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے جیبیں خالی کرنے لگے۔ رملا موہ کے جواہر سنگھ کے پاس جب کچھ نہ رہا تو کانوں کے دُر اتار کر پھینک دیئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جلیبی جان اور ان کے سازندے برسوں اس مجرے کی روٹی کھاتے رہے۔ منی جان کے جوان ہوتے ہی جلیبی جان نے گھنگھرو اتار کر اس کو پہنا دیئے۔ اور آپ چولہا پھونکنے لگیں۔ منی جان اور ننھی جان دونوں بے سُری تھیں۔ گانا ان کے پیشے کا بہانہ تھا۔ صورت شکل میں بھی آدمی کا بچّہ تھیں۔ مگر جوان تھیں۔ جوانی اور رنڈی کی جوانی۔ مان پور کے سارے بے فکرے چونی اٹھنّی کا بند و بست کر کے رنگی چونگی بھڑکا ایسی گول مٹول طوائفوں میں بیٹھ کر ذرا ہنس بول لیتے۔ مجّو خاں اور بکّس مان پور کے دوسرے ہنگاموں کی طرح یہاں بھی پیش پیش رہتے۔ چندہ سے چاندی کے چھنچھناتے ہوئے چار روپئے لے کر مجّو خاں سیدھے بکّس کے یہاں پہنچے۔ اور اس کا ہاتھ اُٹھا کر اپنی جیب پر رکھ لیا۔ بکّس نے یہ خزانہ جو دیکھا تو جلدی جلدی ہاتھ پاؤں دھو کر جاملانی کی قمیص میں چاندی کے زنجیر دار بٹن لگائے اور لاٹھی لے کر مجّو خاں کے ساتھ ہو لیا۔ جلیبی جان کی چھوٹی بیٹی

ننھی جان پر صدقے ہو کر جب یہ لوگ باہر نکل آئے تو فجّو خاں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر خالص مہاجنی انداز میں بجایا۔ روپئے کی شیریں کپکپاتی آواز کی طرح بکس کے اعصاب بھی جھنجھنا اُٹھے۔ وہ اب تک سوچ رہا تھا کہ آخر فجّو خاں کو چار روپے ملے کہاں سے۔

"یار بکس اگر تقدیر سے یاری ہو جائے تو ایک کے چار بن سکتے ہیں..... اور کل پھر"

"یار مجّو بھیا کے کھیت میں آلو بو کر تو ہم بھر پائے جب دیکھو بپّا ٹھینا دیا کرت ہیں کہ جون ہاتھن سے بھیا کے کھیت سے سونا نکالے ہو انھیں ہاتھوں سے اپنے یہاں کچھ کر کے دکھاؤ۔ اور یوں بہانے لے کر بیڑی پینے کا بھی ٹکا نہیں دیت ہیں۔ لے دے کے ایک ٹھکانا بھیّا کا رہ گوا ہے...... باقی سب خیر صلّا ہے۔"

"یار کہیں سے ایک روپیہ بناؤ..... تو چار بازی کھیل لی جائیں۔"

"بھیّا سُن پائے تو کھال اُتار ڈالی جیہے۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"اچھا آج چھوڑو — شاید کل تک کوئی بندوبست ہوئے جائے۔"

⁂ ⁂ ⁂

دوسرے ڈاکوں اور بدمعاشوں کی طرح تراب کا نام بھی چٹخارے دار کہانی کہنے والوں کی زبان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن چندہ کے نام کو پر لگ گئے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر گوشت کی جھوئی سر پر رکھ کر جب وہ گھروں میں جاتی تو نگاہیں چونک

بچونکہ کراس کے جسم کے خطوط میں وہ کہانی ڈھونڈھنے لگتیں۔ جس پر جوار کے سب سے نامی آدمی کا نام لکھا تھا۔ منگلو بجھڑے کی روٹی اور اوجھڑی کا سالن دے کراس کی پیٹھ پر اتنے گھونسے مارتا کہ اس کے پیٹ میں سانس نہ سماتی۔ یہ تو وہ جھیل ہی رہی تھی لیکن فجو خاں کے بکوٹوں کی ٹیس سے وہ بے قرار ہوگئی۔ بیچ کی دیوار پھاند کر جب للّی کی آواز اس کے آنگن میں آکر کدکڑے لگاتی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتی اور اُسے یقین ہو جاتا کہ اسی حرّافہ نے بھیّا سے پستول والی بات داغی ہے۔ اس بدمعاش نے فجو خاں کو گُنیّ کی گھناچھن سُنائی ہے۔ منگلو دوکان بڑھا کر آیا تو اس نے کھال میں نمک بھر کر رکھ دیا اور جھولی سے بھیجے اور گردے نکال کر نئی بنی ہوئی ڈلیا میں رکھتے وقت اس نے طے کر لیا کہ اگر جوتے ہی کھانا ہے تو فجو خاں اور پولیس کے سپاہیوں کے کیوں کھائے جائیں۔ بھیّا کے کھائے جائیں، جن کی ایڑی کے نیچے للّی کی چٹیا بھی دھری ہے۔

⁂

اساڑھ بھرنے لگا تھا۔ گرپوس کی طرح آسمان ننگا پڑا تھا۔ بادلوں کے پیرہن موسم کے پٹارے میں تہہ کئے رکھے تھے۔ سفید دیواروں سے گھرے ہوئے صحن میں دو سیدھے شہتیروں پر ایک آڑا شہتیر جڑا ہوا تھا جیسے فٹ بال کی فیلڈ سے "ایک گول" اکھاڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آڑے شہتیر میں لمبا سا پنکھا جھول رہا تھا۔ مجّو بھیا کی مسہری کے نیچے پڑے ہوئے جوتوں سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر آدمی بھر اونچا اسٹول رکھا تھا۔ اس پر ایک چمار کا لڑکا مشین کی طرح نصب پنکھے کی ڈوری لئے جھوم رہا تھا مگر مجّو بھیا کروٹیں بدلے جا رہے

تھے ۔ بے آب و گیاہ میدان میں سبزے کی جستجو کرتے آہو کی مانند نیند معلوم نہیں کتنی دور نکل گئی تھی۔ مجو بھیا ایک ایک خواب ایک ایک خیال دل کے نہاں خانے سے نکال لائے ۔ لیکن جلتی ہوئی پلکوں میں صلح نہ ہوئی۔ پھر مرغے بولنے لگے ۔ اذانیں ہونے لگیں ۔ استاد مدّی آگئے اکھاڑے میں پٹھے زور کرنے لگے ۔ نوکر اصطبل میں جھاڑو دینے لگے ۔ سائیس گھوڑوں کے کھرارہ کرنے لگے لیکن مجو بھیا سینبھل کی روئی کے تکیوں پر سر رگڑتے رہے ۔ پھر مدّی استاد نے کنکھیوں سے مجّو بھیا کی مسہری دیکھ کر پورن کو نیم کی مسواک توڑنے کا اشارہ کیا۔ پورن نے لاٹھی سے مار کر مسواک توڑی ۔ لنگوٹ میں لگے ہوئے چاقو سے اُسے صاف کیا اپنے بنائے ہوئے بدن پر انگوچھا ڈال کر مجو بھیا کے پائیتی کھڑا ہو گیا۔ دیر کے بعد مجو بھیا نے ہاتھ بڑھا کر مسواک لے لی۔

"زور نہیں کروں گا ...... رام دین کو بلواؤ ..... گر اواں جاؤں گا۔"

پورن مڑ گیا ۔ مجو بھیا مسواک کو دانتوں میں دبا کر تہبند کی گرہ درست کرتے ہوئے دوسرے مکان کے اس بڑے سے کمرے میں گھس گئے ۔ جو غسل خانے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ منواں پاسی نے شیخ مرحوم کے وقت کا سوٹ کیس کھول کر چوڑی دار پاجامہ اور کڑھا ہوا کرتا نکالا ۔ ازار بند ڈالنے کے لئے جھانگر کی لکڑی کو صاف کرنے لگا۔ شیروانی میں چاندی کے بٹن لگا کر گرُدین نے ناشتے کے تیار ہونے کی اطلاع دی۔ لیکن بھیّا نے نفی میں سر ہلا کر رام دین کے ہاتھ سے جوتا لے لیا۔ جو بڑی دیر سے اپنے انگوچھے سے چمکا رہا تھا۔ رام دین اپنے کندھے سے بندوق لگائے کنپٹی پر بہتا ہوا تیل انگلیوں سے پونچھ

رہا تھا۔ بھیّا کو آتا دیکھ کر اس نے بندوق کے فیتے کو گردن میں پہن لیا۔ بجلی کو چمکتی ہوئی
کاٹھی پہنا کر سائیس لے آیا۔ جے جے نے لپک کر ایک رکاب پکڑ لی اور مجّو بھیّا سوار
ہوگئے۔ مان پور سے گکراواں کی کوٹھی تک ان گنت سلاموں کو سر کی جنبش سے قبول
کرتے ہوئے مجّو بھیّا نے پورٹیکو میں سینے تک لگام کھینچ کر بجلی کو روکا۔ جب تک رام دین
اپنے گھوڑے سے اُترے۔ گکراواں کے سپاہی نے چھل بل دکھلاتے ہوئے بجلی کی
لگام پکڑ لی۔ مجّو بھیّا اس کی گردن تھپتھپا کر اُتر آئے۔ کسی خدمت گار نے لپک کر چق
اُٹھادی۔ پنڈت درگا سہائے بھاری تخت کی مسند پر گاؤ لگائے چاندی کی گڑگڑی
پی رہے تھے۔ جھاگ ایسی سفید دھوتی ان کے کولہوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ گردن کی
سنہری زنجیر ان کے ننگے پیٹ کے رقبے کو چھو رہی تھی۔ مجّو بھیّا کے سلام کا مسکرا کر
جواب دیا اور اپنے پاس ہی تخت پر بٹھا لیا۔ خدمت گار پائیدان پر جوتے اتار کر قالین
پر پولے پولے قدم رکھتا آیا اور مجّو بھیّا کی پشت پر کھڑا ہو کر پنکھا ہلانے لگا۔ چھت گیری
سے طلوع ہوتے ہوئے فانوس کے نقش و نگار دیکھتے ہوئے مجّو بھیّا کو درگا سہائے نے
مسکرا کر دیکھا۔

"کیسے نکل پڑے صبح صبح ۔؟"

"آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔"

"ٹھنڈائی نہیں آئی۔"

درگا سہائے نے خدمت گار کو دیکھ کر جھڑکی دی۔

" آ رہی ہے "

اس نے آہستہ سے کہا اور پنکھا تیز کر دیا۔

" تحصیل جا رہے تھے "

" جی..... نہیں..... سنا تھا کوئی جودھپور سے گھوڑا منگوایا ہے آپ نے "

درگا سہائے نے پہلو بدل کر تفخر سے گردن ہلائی۔

" منگوایا ہے "

" ایسی دھوم مچی ہے علاقے میں کہ سن سن کر نیند اڑ گئی "

پنڈت کے پشت کا دروازہ ہٹا کر ایک کالا کالا لڑکا ہاتھوں میں کڑے پہنے آیا اور دو پلیٹوں میں پکوان اور دو گلاسوں میں ٹھنڈائی تخت پر رکھ کر تھالی ہلاتا ہوا چلا گیا۔ درگا سہائے نے ایک پلیٹ اور ایک گلاس مجو بھیا کے سامنے کر کے ٹھنڈائی کا ایک گھونٹ لیا۔

" تو گھوڑا دیکھنے آئے ہو تم..... میں کہوں دن میں چاند کیسے نکل آیا..... کسی سے کہو گھوڑا نکالے "

آدمی مجسم تسلیم ہو کر پنکھا صوفے پر رکھتا ہوا چلا گیا۔

پھر پورٹیکو کے فرش پر ٹاپوں کی آواز آئی۔ مجو بھیا اپنی بے قراری چھپائے بغیر گلاس رکھ کر اُٹھ پڑے۔ سپاہیوں کے ہجوم میں گھوڑا کھڑا تھا۔ سفید گھوڑا..... تصویروں کا گھوڑا..... کہانیوں کا گھوڑا..... خوابوں کا گھوڑا..... جب وہ ہنہنا کر گردن اُٹھاتا تو معلوم ہوتا طاؤس ناچ رہا ہے۔ لمبی گردن کہ سوار کو چھپالے۔ مجو بھیا خواب ناک آنکھوں

سے اس کی شان دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ پھر درگا سہائے مجّو بھیّا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرائے۔ وہ مغرور مسکراہٹ جیسے شکاری اپنے شکار کو پھنستا ہوا دیکھ کر مُسکرائے۔

"دہانہ دیکھ رہے ہو مجّو......... چائے کی پیالی میں پانی دے دو تو پی جائے۔"

"گھوڑا نہیں ہے پنڈت جی..... پری ہے۔"

"ہوں! تو پسند آیا...... اڑا پاؤ تو اڑا کر دیکھو۔"

"ضرور اڑاؤں گا۔"

ایک سپاہی نے لگام بڑھا دی، دوسرے نے لگام تھام لی۔ مجّو بھیّا کو لے کر گھوڑا بجلی کی طرح نکل گیا۔ درگا سہائے گاؤ تکیے سے پشت لگائے گڑگڑی پیتے رہے۔ فرش کے قالین کے پھول چنتے رہے جب مجّو بھیا اندر آگئے تب انھوں نے نگاہ اُٹھائی۔

"چال میں کیسا ہے۔"

"جادو ٹونا۔"

مجو بھیّا کی شیروانی پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خدمت گاران کی پشت پر کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ آرام کرسی پر دراز تھے۔

"آیا کتنے میں یہ پنڈت جی؟"

مجو بھیّا نے بڑی حسرت سے اُن کا منہ دیکھ کر پوچھا۔

"گٹھری بھر روپے میں۔"

بڑی تمکنت سے پنڈت جی نے الفاظ ادا کئے۔ پھر دانتوں میں منہال دبالی۔

"پھر بھی کچھ تعداد تو ہوگی۔"

مجوّ بھیا گڑگڑائے۔

دیر کے بعد پنڈت جی نے مہنال نکالی۔ اُٹھ کر بیٹھے۔ منہ پر آئے ہوئے جملے کی

دھار دیکھی اور مسکرائے۔

"پٹواری کے کاغذات میں جو تمہاری جائداد ہے نا اس سے زیادہ ہے تعداد....

تیس سو روپیہ..... تیس سو۔"

مجوّ بھیا پر جیسے گڑگڑی کا انگارہ اچھل کر گر پڑا ہو۔ ان کی دونوں بھوئیں اچک

کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ رنگ اڑ گیا۔

"ایک فصل میں ایک کھیت کا لسن تیس سو کا بیچتا ہوں پنڈت جی۔" کہتے کہتے

ان کی آواز بھرّا گئی۔

"ہوں..... کلوا مراؤ چونسٹھ سو کا بیچتا ہے۔"

مجوّ بھیا اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خدمت گار نے پنکھا روک لیا۔

"تو کلوا مراؤ سے جوڑ ملایا ہے میرا۔"

"نہیں..... وہ میری رعایا کا بیٹا ہے اور تم نوکر کے۔"

پنڈت جی کے لہجے میں وہی ٹھنڈک تھی۔ وہی زہر تھا۔

"دیکھا جائے گا پنڈت جی۔"

مجوّ بھیا دروازے کی طرف مڑ گئے۔ باہر نکلتے نکلتے اُنھوں نے سُنا۔

"توپ لگوا دینا..... نو دولتا کہیں کا۔"

رام دین کو شہسواری کے جتنے کرتب یاد تھے ان سب کا اُس نے آموختہ پڑھ لیا لیکن بجلی کی گرد بھی نہ ملی۔ جب وہ مکان پہونچا تو سائیس اس کو ٹہلا رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا لگا کر اُٹھا لیا گیا۔ رات کا کھانا لگا کر اُٹھا لیا گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیا کمرے سے نکلے۔ پنکھے کے نیچے لگی ہوئی مسہری پر لیٹتے ہوئے نگاہ کی۔ سارے نوکر قطار باندھے کھڑے تھے۔

"جاؤ تم لوگ۔"

سب بے آواز قدموں سے سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔

پھر صبح ہوئی۔ للّی چمکتی ہوئی آئی، لیکن کمرے کے بند دروازے پر بیٹھے ہوئے پاسی نے کہہ دیا کہ بھیاّ کا حکم ہے کہ کوئی نہ آنے پائے۔ وہ چلی گئی۔ دوپہر کو بوڑھا راج دین بیتاور ایسی مونچھیں چڑھائے ہوئے آیا۔ دالان میں تھم کھڑا گیا۔ جوتے اُتارے۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر ان کی مسہری کے پائینتی بیٹھ گیا۔ مگر نگاہ نہ اُٹھی۔ وہ بیٹھا رہا۔

مغرب کی نماز کے وقت جب گروہیں نے لیمپ جلا کر رکھا۔ دروازے کھول دیئے۔ تو اس کو اور پنکھا کھینچتے ہوئے رام رتن دونوں کو راج دین نے باہر جانے کا اشارہ کیا اس کے بعد وہ کھسک کر مسہری کے تکیے کے پاس آگیا۔

"حکم ہو..... تو گراواں کا گھوڑا کھول کر گھر کے تھان پر باندھ دیا جائے۔"

"گھوڑا چاندی کا نہیں ہوتا جسے سُنار گلا کر دوسرا بنا دے اور پتہ نہ چلے کہ یہ مان پور

کلہے یا گراواں کا؟

"اس کا بھی بندوبست ہے مالک"

"کیا"

"حاجی میٹھے"

"ہوں"

بڑی دیر تک سنّاٹا رہا۔ پھر بڑی دیر تک راج دین سرگوشیاں کرتا رہا۔ عشاء کی اذان کے وقت وہ باہر نکلا اور کسی نوکر کو حکم دیا کہ للّی کو ساتھ لے کر آئے۔ پھر جب بھیّا راج دین اور للّی کمرے کے باہر نکلے تو پہرہ پڑنے لگا تھا دو نوکر للّی کو بھیجنے گئے ......

منگلو کی دھوتی میں بندھے کپڑوں کی گٹھری رکھ کر جب دھوبن چلی گئی۔ تو جنّدہ نے وہ شلوار نکالی جس کے پائنچے پر ہرے پھول کڑھے تھے۔ وہ قمیص نکالی جس کے دامن پہ لال لال گلدستے تھے۔ پھر بالوں سے صاف کئے ہوئے بتانے طوق اور جھانجھیں پہن کر وہ کپڑے لئے کوٹھری میں چلی گئی۔ چھپر کے طاق میں دھرے ہوئے ٹین کے آئینے میں آنکھوں کا کاجل برابر کیا۔ مانجھے ہوئے طباق میں گردے اور بھیجا رکھ کر تانبے کی لگن بند کی۔ اور گھر میں تالا ڈال دیا۔ جھنک جھنک کی آواز سن کر رجب کی اماں نے چپاتی پکاتے ہوئے ہاتھ روک لئے۔

"منگلو کی دولہن ..... آؤ"

"کا بو بو..... بھیّا ہیں ۔؟"

"ہاں ۔"

رجب کی اماں نے آٹے میں ڈوبی ہوئی لوہے کی پھنکنی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ طباق آٹے کی لگن کے پاس رکھ کر دھڑدھڑ کرتے ہوئے کلیجے کو سنبھالے رُک گئی۔ پھر مَن مَن بھر کے پاؤں اُٹھاتی دالان کی طرف چلی۔ مجّو بھیّا کھیت سے آئے تھے۔ چوڑی دار پائجامہ اتار کر تہبند پہن چکے تھے۔ کرتا اتارتے ہوئے دیکھا تو دالان کے در میں چندہ کھڑی شرما رہی تھی۔

"کیا ہے ؟"

اُنھوں نے اپنی روائتی گرجدار آواز میں کہہ تو دیا۔ لیکن ذہن کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تراب کی معشوقہ کے جسم کی اَن دیکھنے کی حسرت نے ان کو ڈس لیا جب وہ کمرے کی دہلیز پر آگئی تو مجّو بھیّا نے دھیمی آواز میں کہا :۔

"چلی آؤ"

تراب کی موت کے بعد ان گنت نگاہوں کے عرفان کی دولت سے چندہ نے اس تھرتھراتی ہوئی آواز میں چھپے ہوئے معنی دیکھ لئے۔ مجّو بھیّا ۔ تراب سے نکلے ہوئے قد کے تراب سے کہیں تندرست اور وجیہہ مجّو بھیّا دیو کی طرح تخت پر بیٹھے تھے ان کے پاؤں کچے فرش پر رکھے تھے۔ چندہ نے ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤں چلا اور اپنا سر مجّو بھیا کے موٹے موٹے پیروں پر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔

"ارے ارے"

مجّو بھیّا نے گھبرا کر اس کا سر اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ تو وہ پھسل کر چندہ کے گالوں پر آ گئے۔ سر اُٹھا تو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں سے کاجل پھیل گیا تھا چہرہ دمک اُٹھا تھا۔ سینے کے فراز پر جھلار اطوق رکھا تھا۔ سرخی مائل کلائیاں اُن کے گھٹنے پر تھیں۔

"منہ سے بولو — کیا ہوا؟"

"مورے پاس پستول نائیں ہے تراب کا۔ دولت نائیں ہے تراب کی۔ بس تراب کی بدنامی مورے سر پر ہے۔"

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

"تم موری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو...... مگر پولیس تھانے نہ بھیجو.... للّی کا میں سے عداوت ہے۔ اگر تراب ان کا موری کوٹھری میں اُٹھائے لئے گئے تو میں کیسے بچائے لیتوں..... ہاں میں نائکہ بنی ہوں تو مجرم..... ایک دن مورے پاس آئیں کہ دوا کے لئے تین روپے دے دیو۔"

"دوا کے لئے...... کاہے کی دوا۔؟"

"وہی جو او کا مرج ہے .... کوڑھ"

"مرض تو نہیں ہے اس کو اب۔"

"بٹیا ہر تیسرے دن جب محلہ بھر سو چکتا ہے تو دوا بنت ہے....

تو میں ان کا روپے دے دیوں.... اب اس دن سے مورے پاس تراب کی گنی جمع ہیں..... ایک گنی میں بھنائے ضرور ہوں..... موری مائے کی ہیں مورے پاس. منگلو سے چرائی ہیں...... منگلو سے چراؤں نہ تو جوئے میں ہار نہ جائے"

"چندہ کی کلائیاں گھٹنے پر رکھی رہیں۔

چندہ کے جانے کے بعد مجو بھیا جو للّی کے دستر خوان سے سیر ہو چکے تھے. للّی کے تصوّر سے مکدّر ہو گئے۔ اُن کے کان میں کسی نے کہا کہ چندہ صحیح کہتی ہے۔ للّی کا مرض گیا نہیں ہے۔ یہ مرض جاتا نہیں ہے اور یہ مرض اُڑ کر لگتا ہے۔ مجو بھیا اُڑ کر لگتا ہے..... اور کیا..... پھر..... تم..... اور گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کھانا ٹھنڈا ہوئے رہا ہے"

رجب کی اماں نے گلاس میں پانی بھر کر کہا۔ مجو بھیا دستر خوان پر بیٹھ تو گئے لیکن کھانا نہ کھایا گیا۔ کتنی جھوٹی ہے یہ للّی۔ کہتی تھی اس کو مرض کبھی تھا ہی نہیں۔ قادر بھی یہی کہتے تھے۔ حاجی میٹھے بھی یہی کہتے تھے۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ ان سب کو یہی کہنا چاہیئے۔ وہ تو یہ سوچتے رہے پھر اُٹھ کر باہر گئے۔ نوکر کو بلا کر راج دین کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور اُسے تاکید کی کہ دوا جلد از جلد حاصل کر لی جائے۔ اور راج دین سیدھا للّی کے یہاں پہنچ گیا۔

ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ دالان میں کھانا لگ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں جلتی ہوئی ڈبیا کی روشنی میں مجو بھیا نے دیکھا کہ للّی آنچل میں چھپائے کوئی چیز لئے

آ رہی ہے۔ وہ کمرے میں کھڑے رہے۔ للّی نے باورچی خانے کی دہلیز ہی پر ایک سینی

میں اپنی گود خالی کی اور کمرے میں چلی آئی۔ دالان میں جلتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی

کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ للّی کے آتے ہی کمرہ جگمگا اُٹھا۔ عہد فراموشی کا گریزاں دامن

مجو بھیا کے ہاتھ سے نکل گیا۔ للّی کے بدن سے ان کے دونوں بازو بھر گئے۔ ڈیوڑھی

میں للّی کے غروب ہو جانے کے بعد جب مجو بھیا نے گوشت کے پیالے میں نوالہ

ڈبویا تو رجّب کی ماں نے ایک چینی کی پلیٹ ان کے آگے بڑھا دی۔

"للّی بڑے لائی رہین"

چینی کی سرمئی پلیٹ میں دہی میں ڈوبے ہوئے سفید سفید بڑے رکھے تھے۔

مجو بھیا کا ہاتھ ان پر منڈلا کر رہ گیا۔ ان کو معلوم ہوا جیسے کسی سانولی لڑکی کے

بدن پر برص کے دھبّے پڑے ہوں۔ اُنھوں نے پلیٹ سامنے سے ہٹا دی۔

ذہن سے اس گھناؤنے تصوّر کو جھٹک کر اُنھوں نے بڑے خلوص سے نوالہ منہ میں

رکھا مگر منہ کا مزہ بدمزہ ہو چکا تھا۔

⁂

گگراواں کی کوٹھی کا پہرے دار گلے میں بندوق پہنے ٹہلتا رہا اور آنکھ سے

کاجل اُڑا لے جانے والے فنکار گھوڑا نکال لے گئے۔ جے پور کے کٹھار میں چار

کی رانیں سے راج دین نے وہ ایال اُتار لئے جن پر درگا سہائے آف گگراواں

کی مغرور انگلیاں مشاطگی کرتی تھیں۔ رام دین اور دلارے نے بیلوں کے سینگ

رنگنے والی سیاہی سے نقرہ جانور کو "ابلق" بنا دیا۔ راج دین اس پر چڑھ کر رانی داتا دھنک پور اپنی بڑی بیٹی کی سسرال پہنچا۔ وہاں "ابلق" کو "مشکی" بنا کر داماد کو سوار کرایا اور خود دس بارہ لٹھ بند لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ضلع ہر دوئی کے رام نگر میں اتر پڑا ــ رام نگر کے کھیا۔ پاسیوں کی ناک اور اپنے سمدھی کے سامنے حاجی میٹھے کی دواؤں کے پشتارے کے ساتھ ساری کہانی بھی رکھ دی۔ ترکیب استعمال کا نسخہ سمجھا کر آندھی کی طرح راجپورہ آیا اور حالات کی نبض ٹٹولنے لگا۔ یہاں ادھم مچا ہوا تھا۔ پنڈت درگا سہائے آف گگراواں کی تحریری رپورٹ کے موصول ہوتے ہی کئی تھانوں کی رپورٹ حرکت میں آگئی ۔ دور دور تک جانوروں کی بازاریں کھنگال ڈالی گئیں۔ تھانے دار نے چائے کی میز پر مجو بھیا سے کہا کہ پنڈت جی کو آپ ہی پر شک ہے۔ مجو بھیا نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا اور کہا اصطبل تو آپ کے سامنے ہے۔ کوٹھریوں کے بکس اگر دیکھنا ہوں تو نوکر سے کنجی لے کر چلے جائیے دیکھ لیجیئے ۔

مغرب کی نماز کے بعد منگلو کھانا کھا کر میلی دھوتی سے منہ پونچھتا ہوا چھپر کے طاق میں بیڑی ٹٹولنے لگا، روپے پر ہاتھ پڑتے ہی اس کی کھینسیں نکل آئیں۔ مڑ کر دیکھا تو چندہ بتیلی کی تری میں روٹی رگڑ رگڑ کر کھا رہی تھی۔ چولہے کی گرمی اور چراغ کی روشنی میں اس کا چہرہ محرم کی روشن چوکی کے سرخ گلاس کی طرح چمک رہا تھا۔ منگلو نے روپیہ اٹھا کر الٹی میں لگا لیا۔ چراغ سے بیڑی جلاتے ہوئے اسے ایک خیال نے بھڑ کی طرح کاٹ لیا "وہ کہیں روپیہ کھوٹا تو نہیں ہے" اس نے بیڑی دانتوں میں دبا لی ۔

چراغ لئے ہوئے تیر کی طرح کوٹھری میں گھس گیا۔ جھینگے سُنار کی طرح اس نے چاندی کو پرکھنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ پھیل گئے۔ روپیہ الٹی میں واپس چلا گیا۔ چندہ کو روٹی کھاتا چھوڑ کر دروازے کو دھڑاک سے بند کرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ چندہ نے جلدی جلدی روٹی ختم کی اور سیدھی طاق پر پہنچی۔ پھر اُس کی آنکھوں نے دیکھا کہ چرسئے کے یہاں بیٹھا ہوا منگلو کوڑی پھینک رہا ہے۔ اُس نے مسکرا کر الگنی پر سے اپنا پھولدار جوڑا اُٹھا لیا، کوٹھری میں چلی گئی۔ دیر تک چراغ کی روشنی میں اپنے جسم پر دھار رکھتی رہی۔ دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے چندہ نے دیکھا کہ للّی اپنی دہلیز پر کھڑی توتو کرکے کتّے کو بُلا رہی ہے۔ اس نے خنک ہوا کے جھونکے سے اپنا مہین چادر اچھین کر سر ڈھک لیا۔ اپنی جھانجوں کو چھن چھن کرتی للّی کے سامنے سے گزر گئی۔ "کہیں پانی برسا ہے۔" جلتے ہوئے دن کے بعد رات کی ٹھنڈی ہوا کے گدگدی پر اُسے خیال آیا۔ حسین موسم کی اس پروائی نے تراب کی چوٹ چمکا دی۔ پرائمری اسکول کے سنسان علاقے کی طرف جاتے ہوئے جب وہ بھنگیوں کے جھونپڑوں کے سامنے سے گزری تو اس نے دیکھا کہ سکرو مہتر دیوار سے ٹیک لگائے پڑا ہے۔ تاڑی کے کُھجڑ اُلٹے پڑے ہیں۔ تھوڑی دور پر بھنگیوں کے لڑکے ڈھولک اور پیزم بجا بجا کر ناچ رہے ہیں۔ ان کے حلقے میں اکڑوں بیٹھا ہوا سکھبندر کوئل کی طرح کوک رہا ہے۔ دیوار میں لگی ہوئی مشعل کی روشنی میں کوئل کی طرح کوکنے والا سکھبندر کوئل ہی کی طرح چمک رہا ہے۔ اس نے چادر کھینچ کر اپنا منہ اور چھپا لیا۔

میدان سے گزر کر جب وہ "چھوٹے اسکول" کی پشت پر پہنچی تو اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ جناتوں والے باغ تک سارے میں سناٹا تھا۔ بانس کی باڑھ میں شیشم کے پیڑ کے پاس ایک تسگاف تھا۔ وہ خندق میں اتر کر آہستہ سے کپڑوں کو بچاتی ہوئی چھوٹے اسکول میں داخل ہوئی، کنپٹی تک کھینچی ہوئی آنکھیں کھول کر اس نے چبوترے کو تاکا جس کے کونے پر تاڑ کا درخت سپاہی کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی چھتری پر برسات کے چاند کی روشن مشعل جل رہی تھی۔ وہ پست بدن چبوترے کی سیڑھیوں پر ٹھٹھک گئی۔ پھر اچھل پڑی، مجو بھیا نے پیچھے سے دبوچ لیا۔

"بڑی دیر کردی تم نے۔"

"منگلو کی وجہ سے۔"

اور اس کا منہ بند ہوگیا۔ مجو بھیا اُسے اپنے کلیجے سے لگائے اس کمرے میں لے آئے، جس کی کھڑکی سے دور پر کھڑا ہوا گول پھاٹک نظر آتا تھا۔ بغیر سلاخوں کی کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی چادر میں مجو بھیا نے چندہ کی آنکھیں دیکھیں۔ سیاہ آنکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ ابرو کی محراب میں لانبی لانبی پلکیں سجدے کر رہی تھیں۔ مجو بھیا نے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

ان طویل ملاقاتوں کی تیز روشنائی مجو بھیا کے دل پر بنی ہوئی للّی کی چمکدار تصویر میلی کرتی گئی۔ حاجی میٹھے کی دوائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ چاندی کی سفید جلد دھندلی ہوگئی۔ گھوڑا "سمند" ہونے لگا۔ عید کے کپڑوں کی آرزو میں چاند رات کی طویل سالن عتو

پر جھنجھلانے والے بچے کی طرح مجو بھیا نے رام دین کو چاندی کے دو سو روپیوں کی گٹھری باندھ دی۔ کملا پور کے میلے میں راج دین نے گگراواں کے گھوڑے کا جوڑ خرید اور بارہ بنکی کے کسی گانوں میں پڑ رہا۔ جب میلا اُجڑ گیا۔ سوداگر تتر بتر ہو گئے تو اس نے بروہی کے جنگل میں خریدے ہوئے گھوڑے کو کھاند کر پھینک دیا۔ کئی کاغذوں میں لپٹی ہوئی رسید شلوکے کی اندرونی جیب میں رکھی، پھر چولا بدلے ہوئے گگراواں کے گھوڑے پر موچی سے خریدا ہوا چابہ جامہ رکھ کر جو چڑھا تو مان پور کے تھان پر دم لیا۔ مان پور کے جنگل میں آگ کی طرح خبر پھیل گئی۔ گگراواں والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے مختار عام بازار کے نیلام کی گفتگو کے بہانے آئے۔ گھوڑا دیکھا۔ چاندی کے ایال کا چنور جھڑ گیا تھا جلد نتر وہی ہو گئی تھی۔ بدن گھٹ گیا تھا۔ مگر کنوتیوں کے وہی تیور تھے۔ پانوں پٹکنے میں وہی جلال تھا۔ مختار عام کی سوچتی ہوئی نگاہ دیکھ رہا تھی ایسے مجوّ بھیا کی چھاتی میں شیر کا دل کانپ گیا۔ مختار عام کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک وہ آرام کرسی کی قبر میں پڑے رہے، پھر گھر کے سامنے میدان میں ٹہلنے لگے۔

دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ فجو خاں چنّی لال چرسیئے کے چھپر میں بیٹھے کھنجڑی پر ہولی سُن رہے تھے کہ سامنے سے منگلو نکلا۔ کسی منچلے نے ہانک لگائی۔ لیکن وہ راس خریدنے کا بہانہ بنا کر پیچھا چھڑا گیا۔ گلیارے کے موڑ پر منگلو کے مڑتے ہی فجو خاں نے بیڑی کو ہتھیلی میں لے کر آخری دم لیا اور اٹھ پڑے۔ کسی نے ہاتھ تک پکڑ لیا، مگر وہ جھٹک کر چلے آئے۔ جندہ بروٹھے میں بیٹھی موبخ کی ڈلیا بُن

رہی تھی۔ نجو خاں کو دیکھ کر اس نے تیور چڑھالئے نجو خاں کھسکے تو گر چندہ گے گریبان میں دھرے ہوئے مٹھائی کے دونے پر ہاتھ ڈال دیا۔ چندہ نے ڈلیا اور سوجا ایک طرف پھینک خانصاحب کے سینے پر مضبوط ہاتھوں کا وہ دوہتر مارا کہ بھونچکے رہ گئے۔ چندہ طاق سے کھال اُدھیڑنے والی چھری اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"جات ہو خانصاحب کہ پکاروں محلّے کو۔"

نجو خاں کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جاتے جاتے ایک خونی نگاہ ضرور ڈالی۔ چندہ کا صحت مند بدن غصّے سے کانپ رہا تھا۔ باہر نکل کر خانصاحب نے حواس درست کر کے نگاہ کی تو اپنے کھیت کے کونے میں للّی بیٹھی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اس کے کولے سے کولہا ملائے بیٹھے رہے اور کلیجے کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔

حاجی میٹھے جب نماز پڑھنے چلے گئے تو للّی نے قلعی دار سینی میں کرکری کرکری برھیوں کے پرت جمائے ان پر کٹھل کے کبابوں کا گلدستہ رکھا۔ لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی سینی اُٹھا کر چلی۔ مجّو بھیا کی ڈیوڑھی میں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ آپ ہی آپ۔ گر وہ چلی گئی۔ باورچی خانے میں ٹین کی ڈبیا جل رہی تھی۔ اس کی خاموش چاپ پر آٹے کی ڈلیا میں اینڈتے ہوئے چوہے خرگوش کی طرح غائب ہو گئے۔ اس نے سینی دہلیز پر رکھ دی اور کمرے کی تیز روشنی کو دیکھتی ہوئی چلی۔ تیسرے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس میں قدم رکھتے ہی چندہ اپنی قمیص درست کرتی ہوئی مجّو بھیا کی گود سے اُٹھ پڑی۔ للّی کو ایسا لگا جیسے سکرو مہتر نے اپنی ڈلیا اس پر اُلٹ دی

ہو۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی، لیکن جیسے کسی نے پیروں میں کیلیں ٹھونک دی ہوں۔ وہ مجسّمے کی طرح نصب ہو کر رہ گئی۔ اسی پلنگ پر، اسی پھولدار بستر پر یہی مجّو بھیّا مجھے چومتے چومتے نڈھال کر دیتے تھے۔ اور آج اسی پلنگ کے اسی پھولدار بستر پر "کلموہی" چندہ بیٹھی اس کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔

"کھڑی کیوں ہو؟"

مجّو بھیّا ڈکارے۔ وہی مجّو بھیّا جن کی سانسیں نہ سماتی تھیں۔ جو اسے دیکھ کر گھگھیانے لگتے تھے۔ وہی مجّو بھیّا اسے دھتکار رہے تھے۔ چندہ اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ للّی نے اپنے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے کو سنبھالا۔ اور گویائی کی ساری قوت جمع کر کے آہستہ سے بولی:

"میں جائے رہی ہوں۔"

"ہاں ـــــ دفعان ہو جاؤ۔"

مجّو بھیّا نے دوسرا جوتا مارا۔ اور کان تک کھینچی ہوئی کمان کی طرح صابر للّی دفعتاً لوٹ گئی۔

"تر اب یہی دن کے لیے مارے گئے رہن۔"

پلنگ سے اُٹھتے ہوئے مجّو بھیّا کے چہرے پر اپنے جملے کا ردعمل دیکھے بغیر وہ مڑ گئی۔

"للّی"

مجّو بھیا کی دہاڑ نے دالان ہی میں للّی کو ڈس لیا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ مجّو بھیا نے اپنا دھنّی ایسا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور ایسے لہجے میں بولے جیسے داروغہ کسی عادی مجرم کو تاکید کر رہا ہو۔

"اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"للّی نے آنکھیں اُٹھا کر مجّو بھیا کو گھورا۔ جن کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"برائی کے لئے ایک چندہ نائیں ہیں...... گکراواں کا گھوڑا۔"

مجّو بھیا کے کان پر جیسے کسی لڑکے نے "چھچھوندر" داغ دی ہو۔ ان کا ہاتھ بے اختیار اُٹھا اور للّی کے پھول ایسے گال پر شبرات کا پٹاخہ چھوٹ گیا۔ للّی کا داہنا کان سن سن کرنے لگا اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"دور ہو جا حرام زادی...... بدمعاش...... نہیں تو بوٹی بوٹی کٹوا کے پھینکوا دوں گا۔"

للّی کے گورے گورے پیروں میں پہیئے لگ گئے۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح ڈیوڑھی میں گھوم گئی۔ دروازے پر ایک آدمی ہانپتے ہوئے ٹٹو کی رسّی پکڑے کھڑا تھا۔ حاجی میٹھے اس کا تنفس دیکھ رہے تھے۔ جیسے حکیم قارورہ دیکھ رہا ہو۔ للّی اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ جب حاجی اندر آئے تو اس نے چادر

سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کبابوں کا کٹورہ برصیوں کی ڈلیا میں رکھ کر پلنگ پر پٹخ دیا۔

"آؤ"

حاجی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"موراجی ماندہ ہے آج"

"اچھا"

حاجی نے کھانا کھایا۔ پھر ڈلیا چھینکے پر ٹانگ دی۔ گھڑونچی کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور عشاء کے لئے چلے گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ فجر کی اذان ہوگئی۔ مگر وہ جاگتی رہی۔

ساون کی دوپہر تھی۔ سورج سیاہ بادل کی دلائی اوڑھے بیچ آسمان میں سو رہا تھا۔ بوندوں کے گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ کچّے مکانوں کی مٹی نمک کی طرح گھل گھل کر گلیاروں میں بہہ رہی تھی۔ جوان جسم کی خوشبو کی طرح بوجھل اور خنک پُروائی دلوں کو گرما رہی تھی۔ مجو بھیا کے دالان میں یہاں سے وہاں تک جاجم بچھی تھی۔ ایک سرے پر مخملی قالین پڑا تھا۔ مجّو بھیا اور اس کے کچھ زمیندار دوست گاؤ تکیوں سے لگے بچھّو کے ڈنک کی طرح کٹیلی مونچھیں انگلیوں میں مروڑ مروڑ کر رقص دیکھ رہے تھے۔ سازندوں کے نیم دائرے کے سامنے تربھون کی نوٹنکی کی گلاب جان سرخ ساری باندھے سرخ چولی باندھے ناچ رہی تھی۔ بجلی بھرے ہوئے

بدن کا انگ انگ بول رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ جس کے سامنے ایک گھٹنے پر بیٹھ کر کاجل لگی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بھاؤ بتلاتی وہ نہال ہو کر اور زور زور سے اپنی مونچھیں انگلیوں میں مروڑنے لگتا۔ دل دھڑک رہے تھے روپے چل رہے تھے کہ تھانے کا سپاہی پنڈت پائیدان پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم سے بھیگا ہوا بورا اتار کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے منہ پونچھ کر مجو بھیا کو سلام کیا۔ رنگ خراب ہو گیا۔

"خیر ہے پنڈت"

مجو بھیا نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ گلاب جان گھنگھرو بندھے پاؤں کی ٹھوکر مار کر پہلے کھڑی ہو گئی پھر سلام کر کے سازندوں کے پاس بیٹھ گئی۔ مجو بھیا کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ گگراواں کی ریاست اور دولت گھوڑے کو سانپ کی منہ کی چھچھوندر نہ بنا دے۔ اُنھوں نے احباب سے معذرت کی اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"میں بھیا اپنا احسان چکانے آیا ہوں"

مجو بھیا کا دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا کہ زبان بند ہو گئی۔

"گگراواں والے پہلے ہی سے چوکنا تھے۔ رہی سہی کسر آپ کے قصبے کی مسماۃ للّی نے پوری کر دی۔ اس نے آج تھانے آکر بیان دیا ہے کہ وہ گھوڑا جو آپ کملا پور سے لائے ہیں وہ گگراواں کا ہے۔ اس کے ایال قینچی سے کاٹ دیئے گئے

ہیں اور رنگ خود اس کی دواؤں سے بدلا گیا ہے اور وہ عدالت میں یہ بیان دینے پر تیار ہے۔"

"پھر"

"مجو بھیا کو سانپ سونگھ گیا۔"

"وہ تو بڑی خیریت ہو گئی۔ بڑے تھانیدار پیشی پر گئے ہیں، چھوٹے تھانیدار اور عملہ راج گھاٹ کی ڈکیتی میں تحقیقات پر گیا ہوا ہے، میں ہی لے دے کے ایک خواندہ سپاہی ہوں۔ اس لئے مساۃ للّی کا سابقہ مجھ ہی سے پڑا۔"

"ہوں...... کون ہے یہاں۔"

"ہاں بھیا۔"

ایک نوکر بھیگی دھوتی باندھے اندر آیا۔

"پنڈت جی کو شربت پلاؤ۔"

کرتے کی ایک جیب تو رنڈی پر نچھاور ہو چکی تھی، دوسری جیب میں ان کا ہاتھ سرسرانے لگا۔

"للّی کے ساتھ کون کون تھا پنڈت۔؟"

"نجو خاں اور بکس۔"

مجو بھیا دھواں دھواں پھر رہے تھے۔ گلاب جان کی بولتی ہوئی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب کی دعوت میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ دوستوں کے

ساتھ وہ بجھے بجھے قہقہے لگاتے رہے اور ہونٹوں کو مانگے کی مسکراہٹ پہناتے رہے
پانی کے مدھم ہوتے ہی گلاب جان اور دوستوں نے رسماً اجازت چاہی اور مجو بھیا نے
سچ مچ ان کو رخصت کر دیا۔ مغرب کی اذان نہیں ہوئی تھی لیکن اندھیرا پھیل گیا
تھا۔ باہری چھپر میں راج دین، بھگا، دلارے، رام دین اور بہت سے آدمی بیٹھے
چلمیں پی رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی گھوڑے کھینچے گئے۔ گگراواں کے گھوڑے پر
راج دین بیٹھا، منکی پر دلارے، اور "بجلی" پر مجو بھیا۔ پانی برس رہا لیکن یہ لوگ
گلیارے کی اتھلی نہر میں چھپر چھپر کرتے چلتے رہے۔ انچولی کے جنگل میں چلور کے درختوں
کے جھنڈ کے پاس یہ لوگ اترے۔ مجو بھیا نے تھرتھراتے ہاتھوں سے گگراواں کے
گھوڑے کی بھیگی بھیگی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اسے اس نگاہ سے دیکھا جیسے عاشق اپنی
دولہن بنی ہوئی محبوبہ کو غیر کے ڈولے میں بٹھاتے وقت دیکھتا ہے۔ رات اور جنگل کے
سناٹے میں چھتنار درختوں پر بوندوں کی ایسی ماتمی لے بج رہی تھی جیسے محرم کے باجے
پھر مجو بھیا نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا لیا اور کنکھیوں سے راج دین کو دیکھا!
جس کے ہاتھ میں بھالی چمک رہی تھی، للّی کے عریاں بازو کی طرح۔
ان کے قریب سے ہٹتے ہی راج دین کا بوڑھا ہاتھ اٹھا اور بھالی گھوڑے کے سینے
میں تیر گئی۔ وہ گولی کھائے ہرن کی طرح اچھلا، لیکن راج دین کے مشاق ہاتھوں
کی مار نے اسے ڈھیر کر دیا۔ راج دین اور دلارے نے آناً فاناً اس کی کھال نکال
کر ایک کٹھری میں باندھ لی۔ سر اور سُم ایک گڈھے میں دفن کر دیئے۔ جب وہ انچولی

کے جنگل میں دھوم مچاتے ہوئے بیتے کے پل سے گزرے تو راج دین نے گٹھری
سمیت کھال جسم سے پانی میں پھینک دی۔ مجّو بھیا کے چھپّر میں جھانکروں کا الاؤ
لگا سب لوگ بدن سینکتے رہے، مجّو بھیا بیٹھے بیٹھے پوری کیتلی کی چائے پی گئے
پانی تھم گیا تھا۔ پھرہ پڑنے لگا تھا۔ مجّو بھیا دیکھ رہے تھے کہ وہ باہری کمرے میں
لیٹے ہیں۔ جان کو گھلا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ پنکھے کو کھینچتے کھینچتے نوکر سو گیا
ہے اور وہ پسینے میں ڈوبے کروٹیں بدل رہے ہیں کہ للّی آگئی۔ اس کو بھیگا ہوا دیکھ کر
پنکھا کھینچنے لگی، کھینچتی رہی، جب تک وہ اُٹھ کر نہ بیٹھ گیا۔ جب تک اس نے
ڈانٹ کر نوکر کو جگا نہ دیا۔ پھر اُنھوں نے دیکھا کہ ان کے سر دی لگ گئی ہے۔ رات
کے دس بج چکے ہیں رجب کی اماں اپنے بیٹے کے گھر گئی ہیں۔ نوکر سب ہندو ہیں
للّی آئی اسی طرح لہراتی ہوئی لہنگے میں بھنور بناتی ہوئی انگیٹھی کی راکھ جھاڑی آگ
بنا کر اس کے پاس رکھی اور گرم گرم چائے بنا کر اسے پلائی اور مزید حکم کی منتظر
کھڑی ہے۔ پھر مجّو بھیا نے دیکھا کہ نوکر دوپہر میں روٹی کھانے گئے ہیں۔ پٹیا پانی برس
رہا ہے۔ دالان تو دالان کمروں میں بوچھار سے ٹخنوں ٹخنوں پانی بھرا ہوا ہے۔ للّی
اپنے گورے گھٹنوں تک بھیگا ہوا سرخ لہنگا چڑھائے تاش لئے پانی الچ رہی ہے۔
آنکھوں سے تھکن ٹپک رہی ہے لیکن ہاتھ "کل" کی طرح چل رہے ہیں۔ پھر مجّو بھیا
نے دیکھا ان کا مُجلی بیمار ہے۔ وہ حاجی میٹھے سے لڑ لڑ کر نئی نئی دوائیں منگا رہی
ہے خود بنا رہی ہے اور اپنے سامنے کھڑی پلوا رہی ہے۔ سارے نوکر تھک کر جا

چکے ہیں۔ مگر للّی اپنے حسین کولہوں پر پھول سے ہاتھ رکھے اس طرح گھوڑے کی کیفیت دیکھ رہی ہے جیسے یہ گھوڑا گھوڑا نہیں اس کا بیٹا ہے۔ اس کے جسم کا ایک حصّہ ہے۔ للّی بھرا گئی، مٹکتی ہوئی چمکتی ہوئی للّی۔ اور ناخوش ہوتے ہوئے بولی کہ بھیّا کا پیاز سوکھ رہا ہے۔ نوکروں کے کہنے پر نہ جاؤ پانی لگواؤ۔ اور قلمی آم کے باغ کی فصل میں چھبیس ہو کی نہ بکنے دوں گی۔ ستائیس سو تو فلاں آدمی میرے سر ڈھے جا رہا تھا۔ کسی نوکر نے للّی کو چھیڑنے کے لئے ہوائی چھوڑ دی۔ کہ "بھیّا" کے کھیت میں گورو تمبا کو چرے جا رہے ہیں اور للّی توے کی روٹی چھوڑ کر لہنگا پھڑکاتی ہوئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر نوکروں کو میٹھی آواز اور کھٹے لہجے میں ڈانٹنے لگی۔ گلاب جان کے لہنگے کے پھولوں کی طرح چمکدار آواز اور اس کے اندر چھپے ہوئے بدن کی طرح قائل معنی نے تھوڑی دیر کے لئے مجو بھیّا کو بے حس کر دیا۔ پھر جیسے کسی طرف سے چندہ اپنی جھانجھیں بجاتی ہوئی آئی۔ اور ان کی موٹی موٹی کلائیاں پکڑلیں ہتھیلی کے پیالوں سے ان کا چہرہ چھلک گیا۔ چندہ ان کی پھنگنی کی طرح موٹی موٹی اُنگلیاں سہلانے لگی۔ مجو بھیّا اس کی آنکھیں دیکھتے رہے چمکدار آنکھیں، جن میں سارے لکھنؤ کے گوٹے کی دوکانیں ہضم ہو گئی ہوں۔ گہری آنکھیں جن میں گگرا واں کا ہاتھی تو خیر ایک طرف، تراب ایسا پانی دار آدمی اپنی ساری ہیکڑی سمیت ڈوب چکا ہو۔ چندہ کے گریبان میں چھپی سونے کی پوٹلیاں جن پر تراب کی ہیبت اپنے نام کی لاٹھی کھینچے پہرہ دے رہی تھی۔ بڑی دیر تک ان کی

چوڑی چوڑی ہتھیلیوں پہ رکھی رہیں۔ چندہ کے بدن کے وہ سارے "ہفت خواں"، جن میں
مان پور کی سور مانگاہیں تھک کر دم توڑ چکی تھیں۔ مجّو بھیا کے بھاری بھر کم قدموں
کے نشانوں کے چراغ جلائے، ان کے قدموں میں دیوالی جلاتے رہے۔ مجّو بھیا
پر نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ ان کے تصوّر نے چندہ کے بدن سے ایک ایک قطرہ
نچوڑ کر پی لیا تھا۔ چندہ کے عریاں بازو ان کی گردن کو لپیٹے فضاؤں میں اُڑنے
لگے تھے کہ لگراواں کے تعلقدار پنڈت درگا سہائے کے فقرے نے ان کو ڈس
لیا اور بلبلا کر ہوش میں آگئے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ لچھمن چوکیدار کا صافہ ان
کی کمر میں بندھا ہے۔ سارے نوکر آنکھ میں آنسو بھرے بلّی کی طرح دبکے کھڑے ہیں
اور جب وہ تھانے دار کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اپنی ڈیوڑھی سے نکلے تو مقتول
تراب کے چھوٹے بھائی نے ان کے منہ پر پڑے ہوئے رومال کو اُلٹ دیا۔ پھر
قہقہوں کا وہ زلزلہ آیا کہ ان کے اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے رسیاں تُڑا
کر نکل گئے۔ جب وہ مان پور کے گنج کے پاس پہنچے تو للّی اپنی سبز چُنری ڈھلکائے
نظر آئی۔ کولھوں پر پھنسے ہوئے لہنگے پہ وہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور ایسی خطرناک
ہنسی ہنس رہی تھی جس کو ان کے ہونٹوں نے بھاگتے ہوئے ہرن کو گولی مار کر اپنے
کلیجے سے لگایا تھا۔ مجّو بھیا نے تلملا کر پہلو بدلا ہی تھا کہ سامنے ہاتھی پر سوار
درگا سہائے نظر آئے۔ مختار عام مشکی گھوڑے کی رکابوں پر کھڑے تھے۔
ہاتھی کے پیچھے سپاہیوں کا پرا لاٹھیاں کاندھوں پر دھرے ٹھٹول کر رہا تھا۔ پھر

اُنھوں نے دیکھا کہ بھری عدالت میں جج نے چوری کے جرم میں چھ مہینے کی سزا کا حکم پڑھ کر سُنا دیا۔ اور چھ بلم ان کے کلیجے میں اُتر گئے۔

"راج دین۔"

"بھیّا۔"

"کیا دیر ہے۔"

"حاجی میٹھے کی گاڑیاں بالامئو کی بازار کے لئے لد رہی ہیں ـــــ ہانک دی جائیں تب اُٹھا جائے۔"

"رام دین۔"

"بھیّا۔"

"بھور بھارہ ہوتے ہی تم تھانے جاؤ اور کملاپور کی بازار سے خریدے ہوئے گھوڑے کی رسید دکھلا کر چوری کی رپٹ لکھا دو۔"

"بہت نیک۔"

ہولناک سنّاٹے نے "جاگتے رہو" کی مدقوق آوازوں کو نگل لیا۔ آوارہ کتے بھونکتے بھونکتے تھک گئے تو دیواروں کے سایوں اور دُکانوں کے پٹوں کی آڑ میں پڑ کر سو گئے۔ وہ روشن ستارے جن کو مان پور والے دوسرے گاؤں والوں کی طرح "ہنّی ہنّا" کہتے تھے۔ پیپل کی پھنگی پر دیوں کی طرح جل اُٹھے۔ جانوروں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی نحیف آوازیں آنے لگیں۔ مارکین کے کفن

کی طرح دُھندلی دُھندلی سفیدی اس مشرق پر پھیلنے لگی جو کئی صدیوں سے مرا پڑا
تھا۔ جاگیرداری نظام کی بیمار قدروں کی طرح سائے سونلانے لگے۔ ٹھنڈی
ہواؤں کی پریاں اپنے پروں پر نئی صبح نئے دور کے پھولوں اور کارناموں کی خوشبو
لے کر مجو بھیا کے آنگن میں اٹکھیلیاں کرنے لگیں تو باہری دروازہ ہاتف کی طرح
بولا اور سب دم بخود ہو گئے۔ دھرم پال سپاہی کہہ رہا تھا۔

"حاجی میٹھے گئے"

راج دین نے جلتی ہوئی چلم کا آخری کش لگا کر چلم دیوار سے لگا کر کھڑی
کر دی۔ پتا در الیسی مونچھوں کو ہتھیلی سے برابر کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے
ہوتے ہی بھگا دلارے رام دین اور مجو بھیا بھی کھڑے ہو گئے۔

آج مجو بھیا کا لنگر قدموں سے اُٹھایا نہ جا رہا تھا۔ محرم کی ساتویں کو جب
فیجو منیہار نے بیماری کا بہانہ کر کے عباسی علم اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور
چھوٹے خاں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ تو مجو بھیا نے وہ آستینیں چڑھائی تھیں
جن کے کلف دار ململ کو للی نے بڑے ریاض سے پاندان کے ڈھکنے پر چُنا تھا اور گلے
میں ڈوپٹی ڈال کر عباسی علم اُٹھا لیا تھا۔ علم لے کے چلتے ہوئے اُنھیں اپنی اہمیت
کا اندازہ اس وقت ہوا تھا۔ جب اُستاد مدّی نے گرج کر "علی کا لشکر" کا نعرہ
مارا تھا اور ہزاروں کے مجمع نے کلیجہ پھاڑ کر دلوں کو ہلا دینے والی آواز میں "یا حسین"
کی تکرار کی تھی۔ لیکن آج مجو بھیا چلتے ہوئے ایسی اذیت محسوس کر رہے تھے۔ جیسے

دو عباسی علم دونوں ہاتھوں پر جھول رہے ہوں۔ وہ راج دین کے پیچھے اور
دوسروں کے آگے چل رہے تھے۔ اونگھتے ہوئے کتے گردن اٹھا کر گرائے۔
پھر ان کے براق کپڑوں کے کفن ایسے سفید جلوے میں منہ ڈھانپ کر رہ جاتے چبوترے
کی سیڑھیاں چڑھ کر ان کے موٹے موٹے ہاتھ نے آہستہ سے تھپکی دی۔ چارپائی
چرچرائی۔ جھانجھیں گنگنائیں۔ شیشے کی چوڑیوں نے سرگوشی کی اور کنڈی بجی اور
دروازہ کھل گیا۔ مٹی کے تیل کی ڈبیہ طاق میں جل رہی تھی۔ اس کی لال روشنی میں
چندہ کھڑی تھی۔ کسمیلی قمیص اور میلی شلوار پہنے چندہ نے دروازے سے ہٹ کر
انگڑائی لی۔ تو اس کے جسم کے خطوط میں چراغ جل گئے۔ الجھے ہوئے کالے کالے
بال کمر تک پڑے ہوئے تھے۔ لانبی لانبی آنکھیں نیند سے سینچی ہوئی تھیں۔ مجو بھیا نے
اسے مخمور نگاہ سے دیکھا۔ دل کی آرزو لہو بن کر ہاتھوں میں دوڑنے لگی۔ لیکن ان
کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو وقت کی نزاکت نے پکڑ لیا۔ رام دین دہلیز پر ہی کھڑا تھا۔
مجو بھیا کا اشارہ پا کر وہ اندر گیا دوسرے آدمی للّی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ چندہ
کی نیم باز آنکھوں سے اپنی پیاسی آنکھوں کو بغلگیر کر کے مجو بھیا نے پوچھا:

"منگلو کو گئے کتنی دیر ہوئی"

"حاجی کے ساتھ ہی وہ ہو گئے ہیں"

چندہ اور للّی کے گھروں کی مشترکہ دیوار پر رام دین لاٹھی لگا کر چڑھ گیا۔
بلّی کی طرح اتر کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ مجو بھیا گردن جھکا کر بازو سے نشانہ

١٣٧

بچاتے ہوئے للّی کے صحن میں آ گئے۔ رام دین پنجوں کے بل چلتا ہوا گیا اور للّی کے دروازے کی زنجیر کھول دی۔ راج دین، بھگّا اور دلارے تینوں آ گئے۔ مجو بھیا نے اپنا مخملی جوتا دروازے پر چھوڑ دیا، جس کو جندہ نے اٹھا لیا۔ چھپر میں دو چار پلنگ بچھی تھیں۔ ایک خالی چارپائی پر زمین کے رنگ کی سکڑی ہوئی دری پڑی تھی۔ سرہانے کثیف تکیہ رکھا تھا۔ دوسرے پلنگ پر للّی لیٹی تھی۔ چت لیٹی ہوئی سیاہ لہنگے کی گوٹ سے چاندی کے گھٹنے جھانک رہے تھے۔ سنگ مرمر کی سڈول پنڈلیاں اندھیرے میں چمک رہی تھیں جیسے "پنشاخے" جل رہے ہوں۔ خرّاٹے لیتی ہوئی للّی کی کرتی میں وہ خربوزے دھڑک رہے تھے جن کی مٹھاس سے تراب کی زبان ہمیشہ کے لئے بندھ گئی تھی۔ باہوں کے خنجر دونوں ہتھیوں پر پڑے تھے۔ جیسے اُن کے قبضے مجو بھیا کی کلائی نے توڑ لئے ہوں۔ میلے میلے تکیہ پر جھبرے جھبرے بالوں کا انبار رکھا تھا۔ جن کے لمس کی خاطر مان پور کے کتنے ہی شانے قلم ہو جانا گوارا کر سکتے تھے۔ مجو بھیا اس کے بے پناہ حسن کے طلسم میں اسیر کھڑے رہے۔ پھر ان کی گردن ہلی۔ شاید مچھر نے بائیں گال پر کاٹ لیا تھا۔ اور اُن کی گردن ہلتے ہی رام دین کی انگلیاں سنگسی کی طرح اس کی گردن کی صراحی میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھڑپھڑائی گر دلارے اس پر سوار ہو گیا۔ وہ ذبح کی ہوئی بٹیر کی طرح مٹھی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ راج دین نے اُسے آلو کے بورے میں ٹھونس کر بھر دیا۔ رام دین نے بورے کو پیٹھ پر لاد لیا۔ دلارے نے للّی کا مکان اندر سے بند کیا۔ پھر جندہ

کے گھر میں کھلنے والی کھڑکی کو للّی کی طرف سے بند کر گے دیوار پھاند کر جندہ کے
گھر میں ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ سڑک پر بڑے بڑے بیلوں کا ادھا گھرا تھا۔
بورا اس میں ڈال کر جاجم بچھادی گئی۔ اور بیل چوک بھرنے لگے۔ ہاہاکار کرتے
ہوئے بیتے کے اونچے پل پر ادّھا روک لیا گیا۔ مجو بھیا نے بجلی کو دوڑا کر ہر طرف
سے اطمینان کر لیا پھر طلوع ہوتی ہوئی صبح کے مٹیالے اندھیرے میں بورا دھار میں
چھوڑ دیا گیا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ مجو بھیا کارتوسوں کی پیٹی ڈالے اور
کندھے پر بندوق رکھے رکابوں پر کھڑے اُبلتے، شور کرتے ہوئے پانی کو دیکھتے
رہے —

مان پور کے ایک ایک دل میں خود رو پیڑ کی طرح یہ بات جم گئی کہ جوان
للّی بوڑھے حاجی کے پوپلے منہ پر تھپڑ مار کر کسی آشنا کے ساتھ نکل گئی ہے۔
معلوم نہیں کتنے آدمیوں نے اسے "نخلو" کے بازار میں ایک بڑی بڑی مونچھوں
والے آدمی کے ساتھ ہاتھ بھر کے گلاس میں لسّی پیتے دیکھا تھا۔ اس واقعہ
نے دوسروں پر خیر جو کچھ اثر کیا ہو۔ لیکن منگلو نے جب جمعہ کے دن بال
بنوائے، اور چاندی کے تاروں کا ایک گچھا اس کی قمیص کے دامن میں گر پڑا
تو چپ سادھ لی۔ عصر کی نماز کے پہلے ہی جندہ نے کھانا پکا کر چھینکے کے سپرد کیا
دروازہ بند کر کے چارپائی کھڑی کی۔ اور اُبٹن لگا لگا کر نہائی پھر اُجلے کپڑے پہن
کر دیر تک ٹین کی پشت کے آئینے میں کاجل لگی اُنگلی آنکھوں میں پھیرتی رہی۔

پھر جب چادر اُٹھا کر چلی تو اس کے لال لال گالوں کو دیکھ کر منگلو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا :-

"کہاں چلیں اتنے بیرے"

"بھیاّ کے یہاں"

وہ تو چلی گئی لیکن منگلو بڑی دیر تک کھٹیا پر لیٹا ہوا جلے ہوئے ناریل کو گڑ گڑاتا رہا اور ذہن پر رینگتے ہوئے بچھوؤں کو پکڑ پکڑ کر مارتا رہا۔

رضو باجی

سیتاپور میں تحصیل سدھولی اپنی جھیلوں اور شکاریوں کے لئے مشہور تھی۔ اب جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے۔ بندوقیں بیچ کر چکیاں لگائی گئی ہیں، اور لائسنس پر ملے ہوئے کارتوس "بلیک" کر کے شیروانیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قصبوں کا زنجیرا پھیلا ہوا تھا جن میں شیوخ آباد تھے جو اپنے مفرور ماضی کی یاد میں ناموں کے آگے خان لگاتے تھے اور ہر قسم کے شکار کے لئے غنڈے، کتّے اور شکرے پالتے تھے۔ ان میں سارن پور کے بڑے بھیّا رکھو چچا اور چھوٹے بھیّا پاچو چچا بہت ممتاز تھے۔ میں نے رکھو چچا کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ ان کے سفید ابروؤں کے نیچے تڑنتی آنکھوں سے چنگاریاں اور آواز سے لپٹیں نکلتی تھیں۔ رضو باجی انہی رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ میں نے لڑکپن میں رضو باجی کے حسن اور

اس جہیز کے افسانے سنے تھے جسے ان کی دو سوتیلی صاحب جائداد مائیں جوڑ جوڑ کر مر گئی تھیں۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں میراثنیں اتنے تقلقے سے ان کا ذکر کرتیں کہ ٹیڑھے بینچے لوگ بھی ان کی ڈیوڑھی پر منڈلانے لگتے۔ جب رضو باجی کی ماں مر گئیں اور رکھو چچا پر فالج گرا تو انھوں نے مجبور ہو کر ایک رشتہ قبول کر لیا۔ مگر رضو باجی پر عین منگنی کے دن جنات آ گئے اور رضو باجی کی ڈیوڑھی سے رشتے کے "کاگا" ہمیشہ کے لئے اُڑ گئے۔ جب رکھو چچا مر گئے تو پاچو چچا ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی درگاہوں کا پیکرمہ کرتے رہے لیکن جناتوں کو نہ جانا تھا نہ گئے۔ پھر رضو باجی کی عمر ایسا پیمانہ بن گئی جس کے قریب پہنچنے کے خوف سے سوکھی ہوئی کنواریاں لرز اٹھتیں۔ جب بھی رضو باجی کا ذکر ہوتا میرے وجود میں ایک ٹوٹا ہوا کانٹا کھٹکنے لگتا اور میں اپنے یادوں کے کارواں کو کسی فرضی مصروفیت کے صحرا میں ڈھکیل دیتا۔ انھیں رضو باجی کا جب رجسٹری لفافہ مجھے ملا تو میں ایسا بدحواس ہوا کہ خط پھاڑ دیا۔ لکھا تھا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں اور میں فوراً سارنگ پور پہنچ جاؤں لیکن اس طرح کہ گویا میں ان سے نہیں پاچو چچا سے ملنے آیا ہوں، اور یہ بھی کہ میں خط پڑھنے کے بعد فوراً جلا دوں۔ میں نے رضو باجی کے ایک حکم کی فوری تعمیل کر دی۔ خط کے شعلوں کے اس پار ایک دن چمک رہا تھا۔ پندرہ سال پہلے کا ایک دن جب میں بی۔ اے میں

پڑھتا تھا اور محرم کرنے گھر آیا ہوا تھا۔

محرم کی کوئی تاریخ تھی اور سارنگ پور کا سپاہی خبر لایا تھا کہ دوسرے دن مسرکھ اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سواریاں اتریں گی۔ ہماری بستی کے محرم سارے ضلع میں مشہور تھے۔ اور یہ مشہور محرم ہمارے گھر سے وابستہ تھے اور دُور دُور سے عزیز و اقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہمارا گھر شادی کے گھروں کی طرح گھم گھمانے لگتا تھا۔ اس خبر نے میرے وجود میں قمقمے جلا دیئے۔ میں رضو باجی کو جن کی کہانیوں سے میرا تخیل آباد تھا، پہلی بار دیکھنے والا تھا۔ عید کی چاندرات کے مانند وہ رات بڑی مشکل سے گزری اور صبح ہوتے ہی میں انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے ادھے جن کو پھرک اور لہڑو بھی کہتے ہیں، سنوارے گئے۔ بیل صابن سے نہلائے گئے، ان کو نئی اندھیریاں، سنگوٹیاں اور رہمیلیں پہنائی گئیں۔ دھراؤ جھولیں اور پردے نکالے گئے۔ گھوڑے کے ایال تراشے گئے۔ زین پر پالش کی گئی اور سیاہ اطلس کا پھٹا باندھا گیا جو اس کے سفید جسم پر پھوٹ نکلا۔ ساتھ جانے والے آدمیوں میں اپنی نئی قمیضیں بانٹ دیں اور جیب خرچ سے دھوتیاں خرید دیں اور دوپہر ہی سے کلف لگی برجس پر لانگ بوٹ پہن کر تیار ہو گیا اور دو بجتے بجتے سوار ہو گیا جب کہ چھ میل کا راستہ میرے گھوڑے کے لئے چالیس منٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھا۔

اسٹیشن ماسٹر کو، جو ہمارے تحائف سے زیر بار رہتا تھا، اطلاع دی کہ ہمارے
خاص مہمان آنے والے ہیں اور مسافر خانے کے پورے کمرے پر قبضہ جما لیا۔
گاڑی وقت پر آئی، لیکن ایسی خوشی ہوئی جیسے کئی دن کے انتظار کے بعد
آئی ہو۔ فرسٹ کلاس کے دروازے میں سارنگ پور کا مونو گرام لگائے ایک
بوڑھا سپاہی کھڑا تھا۔ ڈبّے سے مسافر خانہ تک قناتیں لگا دی گئیں،
آگے آگے پھوپھی جان تھیں۔ ایک رشتے سے رکھو چچا ہمارے چچا تھے اور
دوسرے رشتے سے ان کی بیوی ہماری پھوپھی تھیں، ان کے پیچھے رضو باجی،
پھر عورتیں تھرماس اور پاندان اور صندوقچے اٹھائے ہوئے آرہی تھیں،
چائے کا انتظام تھا، لیکن پھوپھی جان نے میری بلائیں لے کر انکار کر دیا
اور فوراً اس ادھے پر سوار ہوگئیں جو تابوت کی طرح پردوں سے ڈھکا ہوا
تھا۔ رضو باجی بھی اسی میں غردب ہوگئیں جن کے ہاتھ سیاہ برقعوں پر
شعلوں کی طرح تڑپ رہے تھے۔ دوسرے ادھوں پر عورتوں کو سامان
کے ساتھ چڑھا دیا گیا۔ کٹھنا دیس کے پھڑکتے ہوئے سیاہ بیلوں پر
میرا چھوٹا سا ادھا خالی اڑ رہا تھا اور میں پھوپھی جان کے ادھے کے
پہلو میں چھل بل دکھاتے ہوئے گھوڑے پر بھاگ رہا تھا۔ میں جو کبھی
ہوائی بندوق ہاتھ میں لے کر نہ چلا تھا۔ آج بارہ بور کی پنجفیری اس
امید پر لادے ہوئے تھا کہ اگر اڑتا ہوا طاؤس گرا لیا تو رضو باجی فرور

متاثر ہو جائیں گی۔ کچّی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دھندہاری کے جنگل پر میری نگاہیں منڈلا رہی تھیں اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ دور کسی جھاڑی سے کوئی طاؤس اٹھے اور اتنے قریب سے گزرے کہ میں شکار کر لوں کہ پھوپھی جان کا ادّھا رک گیا۔ میں گھوڑا چمکا کر قریب پہنچا۔ آج سے زیادہ کسی جانور کے نخرے بھلے نہ لگے تھے۔

"میرا تو اس تابوت میں دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رضو باجی کی آواز تھی۔ جاڑوں کی صبح کی طرح صاف اور چمکدار!

"تو آپ میرے اڈّھے پر آ جائیے۔"

"مگر اس پر پردہ کہاں ہے؟"

"میں ابھی بندھواتا ہوں۔"

پردہ بندھ رہا تھا کہ پھوپھی جان نے حکم دیا۔

"کسی بوڑھے آدمی سے کہو ان کا ادّھا ہانکے اور کسی عورت کو بٹھال دو۔"

"ادّھا تو میں خود ہانکوں گا۔"

"ارے تو ——— ادّھا ہانکے گا؟"

انھوں نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور میں گھوڑے سے پھاند پڑا۔ ساتھ ہی کسی سپاہی نے میری تائید کی۔

"ایسا ویسا ہانکت ہیں بھیّا۔ بیلن کی جان نکال لیت ہیں۔"

چادروں اور صافوں کا پردہ باندھ دیا گیا۔ رضّو باجی سوار ہوئیں اور بولیں۔

"اس پر اتنی جگہ کہاں ہے کہ بوا بھی دھانس لی جائیں۔"

قبل اس کے کہ بوا اپنے اڈّے سے اتریں میں نے بیل جڑوا دیئے اور پینٹھ لے کر جوپر بیٹھ گیا اور بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھوپھی جان نے کچھ کہا لیکن پانچ جوڑ بیلوں کے گھنے گھنگھروؤں کی تند جھنکار میں ان کی بات ڈوب گئی۔ جب حواس کچھ درست ہوئے اور دماغ کچھ سوچنے پر رضامند ہوا تو جیسے رضّو باجی نے اپنے آپ سے کہا۔

"امّی کے اڈّے کی ساری دھول ہمیں کو پھانکنا ہے۔"

میں نے فوراً لیکھ بدل لی۔ آدمی نے راسیں کھینچ کر مجھے نکل جانے دیا۔ ظالم بیلوں کو دوبارہ لیکھ پر لانے کے لئے میں نے ایک کے پینٹھے اور دوسرے کے ٹھوکر مار دی اور میری مہمیز اس کی ران میں چبھ گئی۔ وہ تڑپا اور قابو سے نکل گیا، اور اچانک رضّو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آگئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے لمس سے سلگ رہا تھا اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔

"روکو۔"

انھوں نے پہلی بار مجھے حکم دیا — میں نے سینے تک راسیں کھینچ لیں۔ بیل ڈلکی چلنے لگے۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی سڑک پر دور تک درختوں کے سنتری کھڑے تھے اور ایک سپاہی میرے گھوڑے پر سوار سائے کے مانند میرے پیچھے لگا تھا۔ رضو باجی نے برقعہ کا اوپری حصہ اتار دیا تھا، اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دار و مدار تھا، چہرے کے گرد پڑے دہک رہے تھے اور وہ ایک طرف کا پردہ جھکا کر جنگل کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی قاتل گرفت نے ایک بار پھر میرے چٹکی لی اور میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا۔ اور ایک بار پھر ان کے سفید ریشمی ہاتھ میری کمر کو نصیب ہو گئے۔ لیکن اب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اور میں بیلوں کو پھنکار رہا تھا اور ان کا سر میری پشت پر رکھا تھا۔ اور میں اڑتی ہوئی ریشمی لٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ باغ نظر آنے لگا جن کے سائے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ بسرکھ سے میرے گھر کا راستہ کبھی اتنی جلدی نہیں ختم ہوا، اتنا دلکش نہیں معلوم ہوا۔ میں نے اڈھار روکا، پردہ برابر کیا۔ سپاہی کو جوے پر بٹھا کر خود گھوڑے پر سوار ہوا۔ بستی میں بیل ہانکتے ہوئے داخل ہونا شایانِ شان نہ تھا۔ رضو باجی مجھے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ جب وہ اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو میں نے پہلی بار ان کا سراپا دیکھا اور ان کے حسن کے سامنے

میراثنوں کی تمام کہانیاں ہیچ معلوم ہوئیں۔ وہ مجھ سے تھوڑے دنوں
بڑی تھیں، لیکن جب انھوں نے میری پیٹھ پر سر رکھا اور ٹھنک کر
کہا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنی بھابھی جان اور میری اماں سے مرمت کرائیں گی
تو وہ مجھے بہت چھوٹی سی معلوم ہوئیں۔ جیسے میں نے ان کی گڑیا نوچ
کر پھینک دی ہو اور وہ مجھے دھمکیاں دے رہی ہوں۔

میں جو محرم میں سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات باہر گزارا
کرتا تھا اس سال باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا اور بہانے ڈھونڈھ ڈھونڈھ
کر اندر منڈلایا کرتا تھا۔ نویں کی رات سال بھر میں واحد رات ہوتی تھی،
جب ہمارے گھر کی بیبیاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا
جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کے بجائے وہ موٹی موٹی چادر
اوڑھ کر نکلتی تھیں، لیکن دور چلتے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگ جان جاتے
تھے اور عورتیں تک راستہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جب رات ڈھلنے لگی اور
سب لوگ سوتی چادریں اوڑھ کر یعنی بھیس بدل کر جانے کو تیار ہوئے
تو پتہ چلا کہ رضو باجی سو گئی ہیں۔ کسی نے جگایا تو پتہ چلا کہ سر میں درد
ہے اور میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔ جب بیبیوں کے پیچھے چلتے ہوئے
سپاہیوں کی لاٹھیاں اور لالٹینیں پھاٹک سے نکلنے والی سڑک پر کھو گئیں
تب میں اندر آیا۔ وہ دالان میں سیاہ کامدانی کے دوپٹے کا پلو سر پر

ڈالے سو رہی تھیں ۔ ایک عورت پنکھا جھل رہی تھی دوسری ان کی پائینتی پڑے کھٹولے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی ۔ میں نے ان کی سفید گداز کلائی پر میٹھی سی چٹکی لی ۔ انھوں نے منھ کھول دیا ۔

"چلئے آپ کو تعزیے دکھلا لائیں ۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں ۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا جسے انھوں نے عورتوں کو دیکھ کر جلدی سے چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئیں ۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے ۔"

"زیارت کی برکت سے دور ہو جائے گا ۔"

میں نے بڑے جذبے سے کہا انھوں نے کپڑوں پر نگاہ ڈالی ۔

"اگر ان سے خراب کپڑے آپ کے پاس ہوں تو پہن لیجئے ۔"

اور میں نے ان کے پلنگ سے چکن کی چادر اٹھا کر ان کے شانوں پر ڈال دی ۔

اپنے تعزیے کے پاس بیٹھی ہوئی بھیڑ سے چند پاسی منتخب کئے ۔ ان کو بندوق اور ٹارچ لینے کی ہدایت کی اور رضو باجی کو لئے ہوئے سڑک پر آگیا ۔ مجھے بیبیوں کے راستے معلوم تھے جو محرم کے جلوس کی طرح مقرر تھے اور میں مخالف سمت میں چل رہا تھا ۔ کٹا ہوا چاند تہائی آسمان پر روشن تھا اور ہم بستی کے باہر نکل آئے تھے اور میں خود اپنے منصوبے

سے لرز رہا تھا۔ پھر وہ تالاب آگیا جس کے پاس ٹیلے پر مندر کھڑا تھا
اور سامنے اِملیوں کے دائرے میں لکھوری اینٹوں کا کنواں تھا، میں نے
اپنے رومال سے پختہ جگت صاف کی۔ نوخیز پاسیوں کو حکم دیا کہ وہ مندر
کے اندر جاکر بیٹھ جائیں۔ اب حدِ نگاہ تک دمکتے پانی اور آبادی کے
دھندلے خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف املی کے درختوں
کا گھنا سایہ پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ اُن کے پاس بیٹھ کر
پہلی بار اُن کو مخاطب کیا۔

"یہ کنواں دیکھ رہی ہیں آپ؟"

مجھے خود اپنی آواز بھیانک معلوم ہوئی۔

"یہ جناتوں کا کنواں ہے۔"

انھوں نے پوری شربتی آنکھوں کو کانوں تک کھول دیا اور میری
طرف ذرا سا سرک آئیں۔

"اس میں جنّات رہتے ہیں۔"

وہ میرے اور قریب آگئیں۔ ان کا زانو میرے جسم سے مس کرنے لگا،
میں بھاٹوں کی طرح لاتعلق لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ جنات میرے ایک دادا کے شاگرد تھے۔ جب دادا میاں اس
کنوئیں میں ڈوب کر مر گئے تو جناتوں نے یہاں اپنا بسیرا کر لیا۔"

انھوں نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا، چادر ان کے شانوں سے ڈھلک گئی۔ گھٹی گھٹی آواز میں بڑے کرب سے بولیں۔

"چلو ـــــ یہاں سے بھاگ چلو۔"

اور ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں نے سرخ بالوں کی ریشمی لپٹوں میں اپنے ہاتھ جلا لئے، جن کے داغ آج بھی جلد کے نیچے محفوظ ہیں۔

محرم کی اِس رات کے آخری حصّے میں جو شخص اس کنوئیں سے اپنے دل کی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے۔

وہ مجھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں، اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔

"آپ ذرا دیر کے لئے چھوڑ دیجئے میں ایک دعا مانگ لوں...
آج کے بعد پھر کبھی اس کنوئیں سے کوئی دعا نہ مانگوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھیں اور مجھ کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلیں۔ جب پاسی کھڑے ہو گئے تب وہ مجھ سے الگ ہوئیں۔ سڑک پر آکر مچل گئیں کہ گھر جاؤں گی مگر میں ان کو بہلاتا ہوا امام باڑے کی طرف چلا۔ یہ امام باڑہ نواب نقی علی کی اس بہن نے بنوایا تھا جو واجد علی شاہ کی محل تھی۔ آج بھی اس کی اولاد موجود ہے جو امام باڑے والیوں کے نام سے مشہور

ہے اور یہ عمارت انہی کے عمل میں ہے۔ یہاں کربلائے معلّٰی سے لائی ہوئی ضریح رکھی ہے۔ عورتیں اپنے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر مراد مانگتی ہیں۔ جب پوری ہو جاتی ہے، تو اپنی لٹ کھول لے جاتی ہیں۔ ایک پاسی نے دوڑ کر امام باڑہ مردوں سے خالی کرادیا۔ پھاٹک میں عورتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ بستی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے گھر کا کوئی فرد کسی عورت کے ساتھ محرم دیکھنے نکلا ہو۔ زیارت کرنے نکلا ہو۔ دالان کے پاس ایک گدبدی سی لڑکی میرے جوتے کھولنے آئی۔ میں نے رضو باجی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ان کے سینڈل کھولنے لگی۔ جب میں اس ہال میں داخل ہونے لگا جس میں سونے کے پانی کی ضریح رکھی ہے تو وہی لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی "بٹیا صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ باہر ہی رہیں۔" اور میں باہر ہی کھڑا رہا۔ جب میں ان کے ساتھ امام باڑے سے نکل رہا تھا تو ان گنت مرد مجھے کنکھیوں سے گھور رہے تھے۔ عورتیں گھونگھٹ سے جھانک رہی تھیں اور میرے اعصاب کی کمان کھنچی ہوئی تھی کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"کون ہیں؟"

"بڑے بھیا کی دولھن ہیں۔"

اور میں لڑکھڑا گیا۔ رضو باجی کے سر سے چادر کا جھونپا ڈھلک گیا۔

جب سڑک ویران ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ رضو باجی کا چہرہ لمبی چوڑی مسکراہٹ سے روشن ہے۔ میں ان کے بالکل قریب ہو گیا۔

"آپ بہت خوش ہیں"!

"اوں ـــ ہاں ـــ نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر"

اور میں اس جملے کے معانی سوچتا رہا۔

پھر ہمارے مقدر میں کوئی ایسی رات نہ لکھی گئی جو ان کے قریب سے مہک سکتی۔ ایک آدھ بار ان کی صورت دیکھنے کو ملی بھی تو اس طرح جیسے کوئی چاند دیکھ لے اور جب میں سارنگ پور کی ڈیوڑھی پر تانگے سے اترا تو دیر تک کسی آدمی کی تلاش میں کھڑا رہا، دن دہاڑے وہاں ایسا سناٹا تھا، جیسے اس شاندار بوسیدہ عمارت میں آدمیوں کے بجائے روحیں آباد ہوں۔ میں دوہری ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور آواز دی۔

"میں اندر آجاؤں"!

ایک بوڑھی پھٹی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں"؟

"میں حشمت اللہ کا اجن ہوں"

"ارے ـــ آئیے ـــ بھیا آجائیے"!

بھاری پختہ صحن پر میرے جوتے گونج رہے تھے۔ بارہ دروں کے دوہرے دالان کی اسپینی محرابوں کے پیچھے لانبے لانبے کمروں کے اونچے اونچے دروازے کھلے تھے اور دوسری طرف کی عمارت نظر آرہی تھی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چونک پڑا یا ڈر گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے سفید چوکے پر سفید کپڑے پہنے ہوئے بھاری بھرکم رضو باجی کھڑی تھیں، چنا ہوا سفید دوپٹہ ان کے شانوں پہ پڑا تھا اور سرخ و سفید بال انکی پیٹھ پر ڈھیر تھے۔ وہ گردن گھمائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اترتی ہوئی شام کی مدھم روشنی میں ان کے زرد چہرے کی سیاہ شکنیں صاف نظر آرہی تھیں، وہ کانوں میں بیلے کے پھول اور ہاتھوں میں صرف گجرے پہنے تھیں۔ میں ان کی نگاہ کی ویرانی سے کانپ اٹھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے رہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ کسی میں نہ پلک جھپکنے کی طاقت تھی، نہ زبان کھولنے کا حوصلہ پھر جیسے وہ اپنی آواز کا سہارا لے کر تخت پر ڈھے گئیں۔

"تم ایسے ہو گئے ـــــ اجن؟"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں چوکے کے کونے پر ٹک گیا۔

"مجھے اس طرح کیا دیکھ رہے ہو، مجھ پر جو گزری وہ اگر پتھروں

پر گزرتی تو چُور چُور ہو جاتے۔ لیکن تم کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسے کالے
دُبلے کھپٹا سے ہو گئے ہو۔ نوکر ہو نا ـــ اچھی بھلی تنخواہ پاتے ہو۔ زاہدہ
جیسی بیوی ہے، پھول ایسے بچے ہیں، نہ قرض ہے نہ مقدمے بازی،
تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا چُپ کا روزہ رکھ لیا۔"

میں نے دل میں سوچا جناتوں کا سایہ ہے نا ان پر۔

"آپ نے پندرہ برس بعد روزہ توڑنے کو کہا بھی تو اس وقت
کہ زبان ذائقہ بھول چکی اور معدہ قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا۔"

انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پہ سینگ نکل آئے
ہوں۔ وہ بوڑھی عورت میرے سوٹ کیس کو نیچے سے لئے ہوئے چلی آ رہی
تھی، پھر پاچو چچا آ گئے۔ دبلے پتلے سے پاچو چچا جن کے شکار کی ایک
زمانے میں دھوم تھی۔

رات کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جب رضو باجی
اٹھ گئیں تو چچی جان نے سرگوشی میں کہا۔

"آج نوچندی جمعرات ہے۔ بٹیا پر جن کا سایہ ہے وہ آنے
والے ہیں۔ تمھارا بستر اپنی طرف لگوایا تھا، لیکن بٹیا نے اٹھوا لیا، اگر
ڈرنا تو آواز دے لینا یا چلے آنا، بیچ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔"

جمعرات کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر خاموش رہا۔

ان کے ہاتھ سے گلوریاں لے کر منہ میں دبائیں اور کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو تھپکتی رہیں۔ پاچو چچا مجھے بھیجنے آئے۔ دالان میں دو بستر لگے تھے۔ ان کے درمیان ایک کھٹولہ پڑا تھا جس پہ رضّو باجی کی بوا ڈھیر تھیں۔ پاچو چچا مجھے صحن میں چھوڑ کر لالٹین لئے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ایک کالا جھبرا جھبرا کتّا ایک طرف سے نکلا اور مجھے سونگھتا ہوا چلا گیا۔ پھر ایک دروازے سے رضّو باجی نکلیں اور سارے میں مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ ان کے کپڑے نئے اور پھول تازے تھے۔ صحن میں اکتوبر کی چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ برساتی میں کرسیوں پر ہم بیٹھے ٹھنڈی سفید گاڑھی کافی پی رہے تھے، اور گفتگو کے لئے الفاظ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ جناتوں کا کیا قصّہ ہے رضّو باجی؟"

مجھے اپنی آواز پر حیرت ہوئی۔ میں نے یہ گولی کس طرح داغ دی تھی۔ انھوں نے بیبانی کے دی مسکرائیں۔ وہ پہلی مسکراہٹ عمر بھر کے غموں سے زیادہ غمزدہ تھی۔

"میں نے تم کو اسی لئے بلایا ہے۔"

"کاش آپ نے اس سے پہلے بلایا ہوتا۔"

بیاہ کی طرح بے حیائی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اچّن.... دس

برس پہلے کیا یہ ممکن تھا کہ تم اس طرح کھلے خزانے آدھی رات کو
مجھ سے باتیں کر رہے ہوتے؟ آج تم گھر بار والے ہو۔ میں کھوسٹ
ہو گئی ہوں اور رچی جان کا باورچی خانہ میری جائداد سے روشن ہے۔
خیر چھوڑو ان باتوں کو، میں حج کرنے جا رہی ہوں اور حج کرنے والے
ہر اس شخص سے معافی مانگتے ہیں جس کے ساتھ انھوں نے کوئی زیادتی
کی ہو، تم کو معلوم ہے مجھ پر جنات کب آئے؟ آج سے دس سال پہلے،
اور تم کو معلوم ہے تمھاری شادی کو کتنے برس ہوئے؟ دس سال.
تم کو ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ تم نے
چتر ہٹا کے سفر میں کیا کیا؟ تم محرم کی نویں تاریخ مجھے کہاں کہاں
گھسیٹتے پھرے؟ تم اس بھیانک کنوئیں سے میرے سامنے کیا مانگنا
چاہتے تھے۔ تم نے عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے
ہوئے کیسے پانے کی آرزو کی تھی؟ جاؤ اپنے امام باڑے کی ضریح کو
غور سے دیکھو۔ میرے بالوں کی سرخ لٹ آج بھی بندھی نظر آئے گی۔
اگر کھچڑی نہ ہو گئی ہو۔ کیا میں نے امام حسین سے صرف ایک عدد شوہر
مانگنے کے لئے یہ جتن کئے تھے؟ سارنگ پور کی ناؤنوں اور میراثنوں
سے پوچھو کہ وہ رشتے لاتے لاتے تھک گئیں، لیکن میں انکار کرتے
نہ تھکی۔ کیا مجھ سے تم یہ چاہتے تھے کہ میں سارنگ پور سے ستو باندھ کر

چلوں اور چتر ہٹّہ کی ڈیوڑھی پر دھونی رما کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں کہ حضور مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کر لیں کہ زندگی سوارت ہو جائے۔ تم نے رکھّو میاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو رکھّو میاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی!"

"لیکن رضّو باجی!"

"مجھ پر جنّات نہیں آتے ہیں اجّن میاں! میں جنّاتوں کو خود بُلاتی ہوں۔ اگر جنّات نہ آتے تو کوئی دولھا آچکا ہوتا اور تب اگر جنّاتوں کا کنواں، عبّاسی علم اور ضریح مبارک تینوں میرے دامن کو ایک مراد سے بھر دینے کی خواہش کرتے تو میں کیا کرتی؟ کس منھ سے کیا کہتی۔ اس لئے میں نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اُسی طرح جس طرح چتر ہٹّے میں تم مجھ سے کھیل رہے تھے۔ نہ اس میں تمھارے لئے کوئی حقیقت تھی اور نہ اس میں رضّو کے لئے کوئی سچائی ہے۔ یہ حج میں اپنے باپ کے لئے کرنے جارہی ہوں جو میرے بوجھ سے کچل کر مر گئے۔ جنھوں نے مرتے وقت بھی اپنی عقبیٰ کے لئے نہیں، میری دنیا کے لئے دعا کی۔ اس لئے میں نے تم کو معاف کیا۔ اگر تم زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف کر دیتی!"

وہ نرکل کے درخت کی طرح لرز رہی تھیں۔ ان کا چہرہ

دونوں ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔ دو رنگی شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ سرخ بالوں میں برابر سے پروئے ہوئے چاندی کے تار جگمگا رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی۔ جیسے میری بیوی نے مجھے اطلاع دی ہو کہ میرے بچے امیرے بچے نہیں ہیں۔
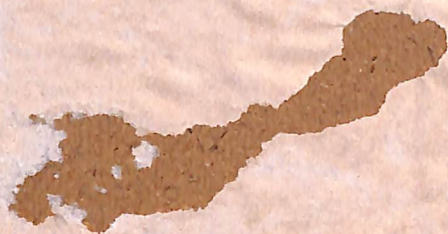
تعارف

قاضی عبدالستار ۹ فروری سنہ ۱۹۳۳ء کو
سیتاپور (اودھ) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے
سنہ ۱۹۴۸ء میں ہائی اسکول اور سنہ ۱۹۵۰ء میں
انٹرمیڈیٹ آر۔آر۔ڈی کالج سیتاپور سے پاس
کیا۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں بی۔اے۔آنرز اور سنہ ۱۹۵۴ء
میں ایم۔اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ لکھنؤ
یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اور گولڈ میڈل
حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں علیگڑھ یونیورسٹی
کے شعبہ اُردو میں بحیثیت استاد تقرر ہوا۔ اِسی
سال "اردو شاعری میں قنوطیت" پر مقالہ لکھ کر
پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ ابتک چھے ناول
اور آٹھ افسانے شائع ہوئے ہیں۔ جو ہندوستان
کی مختلف ادبی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔